فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

ترجمۂ آیات ۲۳۲-۲۳۷

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو تم اس بات میں مزاحم نہ ہو کہ وہ اپنے ہونے والے شوہروں سے نکاح کریں جب کہ وہ آپس میں معاملہ دستور کے مطابق طے کریں۔ یہ نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے، اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ۲۳۲

اور مائیں اپنے بچوں کو ان لوگوں کے لیے پورے دو سال دودھ پلائیں جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہتے ہوں۔ اور بچے والے کے ذمے بچوں کی ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ کسی ماں کو اس کے بچے کے سبب سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کے سبب سے اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور صلاح سے دودھ چھڑا دینا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، جب کہ تم ان کو دستور کے مطابق وہ ادا کرو جو تم نے دینے کا وعدہ کیا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۳۳

اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے بارے میں

چار ماہ دس دن توقف کریں پھر جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور اس بات میں بھی کوئی گناہ نہیں جو تم ان عورتوں سے پیغامِ نکاح کے قسم کی بطریق کنایہ و اشارہ کہو یا اپنے دلوں میں رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان سے ذکر کرو گے لیکن چپکے سے ان کے ساتھ نکاح کا قول و قرار نہ کر بیٹھو، ہاں دستور کے مطابق کوئی بات کہہ سکتے ہو۔ اور عقدِ نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک قانون اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ ۲۳۴-۲۳۵

اور اگر تم عورتوں کو اس صورت میں طلاق دو کہ نہ ان کو ہاتھ لگایا ہو اور نہ ان کے لیے متعین مہر مقرر کیا ہو تو ان کے مہر کے باب میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ البتہ ان کو دستور کے مطابق دے دلا کر رخصت کرو، صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق، یہ بھلے لوگوں پر حق ہے۔ اور اگر تم نے ان کو طلاق تو دی ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے لیکن ایک متعین مہر ٹھہرا چکے ہو تو مقررہ مہر کا آدھا ادا کرو الّا آنکہ وہ اپنا حق چھوڑیں یا وہ اپنا حق چھوڑے جس کے ہاتھ میں سر رشتۂ نکاح ہے اور یہ کہ تم اپنا حق معاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اور تمھارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو نہ بھولو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۳۶-۲۳۷

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ

بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ ذٰلِكَ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمۡ اَزۡكٰى لَكُمۡ وَاَطۡهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (۲۳۲)

'عضل' کا مفہوم

'عضل' کے معنی رکاوٹ پیدا کرنے اور اڑنگے ڈالنے کے ہیں اور 'اَزۡوَاجَهُنَّ' میں ازواج سے مراد ان کے وہ ہونے والے شوہر ہیں جن سے آئندہ وہ نکاح کرنے کی خواہش مند ہیں۔

مطلقہ کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے

جو عورت طلاق پا کر اپنی عدت پوری کر چکی ہو وہ آزاد ہے کہ جہاں پسند کرے نکاح کرے۔ اس کے اس ارادے میں طلاق دینے والے شوہر یا اس کے خاندان والوں کو کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرنی چاہیے، عام اس سے کہ یہ رکاوٹ صریح ممانعت کے قسم کی ہو یا اندرونی سازش اور جوڑ توڑ کی نوعیت کی۔ بعض خاندانوں اور برادریوں میں یہ جہالت پائی جاتی ہے کہ اگر ان کے اندر کوئی عورت بیاہی جا چکی ہو تو اس کے طلاق پا جانے یا اس کے شوہر کے وفات پا جانے کے بعد بھی یہ لوگ برداشت نہیں کرتے کہ ایسی عورت کہیں اور نکاح کرے، اس میں وہ اپنی توہین خیال کرتے ہیں اور طرح طرح کے اڑنگے اس کے راستے میں ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے سبب سے بسا اوقات قتل و فساد کے نہایت سنگین حادثے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح یہ جہالت ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے، اسی طرح عرب میں بھی پائی جاتی تھی۔ قرآن نے اس سے روکا کہ جس نے ایک عورت کو طلاق دے چھوڑی اب اسے اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کا کوئی حق نہیں رہا، وہ جہاں چاہے اور جس کے ساتھ اس کا معاملہ طے پا جائے اگر معاملہ دستور کے مطابق طے پایا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

'دستور کے مطابق' سے مراد یہاں عرب کے شرفاء کا وہ رواج و دستور ہے جس کو اسلام نے برے رواجوں سے پاک کر کے اسلامی شریعت کا جزو بنا لیا تھا اور بہت سے معاملات میں لوگوں کو انہی پر عمل کرنے کی یا تو ہدایت کی یا ان پر عمل کی آزادی دے دی۔ یہاں معاملہ طے کرنے کے لیے معروف کی جو شرط لگائی ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ معاملہ طے کرنے میں کوئی ایسی بات نہ کریں جو شریف خاندانوں کی روایات کے خلاف ہو اور جس سے سابق شوہر یا ہونے والے شوہر یا خود عورت کے خاندان کی عزت و شہرت کو بٹہ لگنے کا اندیشہ ہو۔

فرمایا کہ یہ نصیحتیں ان لوگوں کو کی جا رہی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، یعنی جن لوگوں کے اندر خدا اور آخرت پر ایمان موجود ہے ان کے ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ان نصیحتوں پر عمل کریں۔ پھر فرمایا کہ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے۔ یعنی اگر عورت کی حسب مرضی نکاح کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو اس سے خاندان اور پھر معاشرے میں بہت سی برائیاں پھیلنے کے اندیشے ہیں۔ یہیں سے خفیہ روابط، پھر زنا، پھر اغوا اور فرار کے بہت سے چور دروازے پیدا ہوتے ہیں اور ایک دن ان سب کی ناک کٹ کے رہتی ہے جو ناک ہی اونچی رکھنے کے زعم میں فطری جذبات کے

مقابل میں بے ہودہ رسوم کی رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے" یعنی تمھارا علم اور تمھاری نظر بہت محدود ہے، تمھارے لیے زندگی کے تمام نشیب و فراز کو سمجھ لینا بڑا مشکل ہے اس وجہ سے جو کچھ تمھیں خدا کی طرف سے حکم دیا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۤ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۳۳)

رضاعت سے متعلق مسائل

اس آیت میں رضاعت سے متعلق اکٹھے بہت سے مسائل بیان ہو گئے ہیں جو بالترتیب یہ ہیں۔

۱۔ مطلقہ پر اپنے بچے کو پورے دو سال دودھ پلانے کی ذمہ داری ہے اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت یہ رضاعت کی مدت پوری کرے۔

۲۔ اس مدت میں بچے کے باپ پر مطلقہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری ہے اور اس معاملہ میں دستور کا لحاظ ہوگا یعنی شوہر کی حیثیت، عورت کی ضروریات، اور مقام کے حالات پیش نظر رکھ کر فریقین فیصلہ کریں گے کہ عورت کو نان و نفقہ کے طور پر کیا دیا جائے۔

۳۔ فریقین میں سے کسی پر بھی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، نہ بچے کے بہانے سے ماں کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی اور نہ بچے کی آڑ لے کر باپ پر کوئی ناروا دباؤ ڈالا جائے گا۔

۴۔ اگر بچے کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہٖ یہی پوزیشن مذکورہ ذمہ داریوں اور حقوق کے معاملے میں اس کے وارث کی ہوگی۔

۵۔ اگر باہمی رضامندی اور مشورہ سے دو سال کی مدت کے اندر ہی اندر بچے کا دودھ چھڑا دینے کا عورت مرد فیصلہ کرلیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

۶۔ اگر باپ یا بچے کے ورثا بچے کی والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہتے ہیں تو وہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں بشرطیکہ بچے کی والدہ سے دینے دلانے کی جو قرارداد ہوئی ہے وہ پوری کر دی جائے۔

آخر میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب خدا کے سامنے کرتے ہو، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی۔

مذکورہ بالا معاملات عام حالات میں تو عورت اور مرد اور متعلقہ خاندان کے ذمہ داروں کے خود طے

کر لینے کے ہیں لیکن اگر کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو انھی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر پنچائتیں اور عدالتیں فیصلہ کر دیں گی۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۳۴)

بیوہ کی عدت

اگر کسی عورت کے شوہر کی وفات ہو جائے تو ایسی عورت کی عدت چار ماہ دس دن ہے (اور حاملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل) عام مطلقہ کی نسبت سے بیوہ کی عدت میں یہ اضافہ استبرائے رحم، عورت کی سہولت اور سوگ وغیرہ کی مختلف مصلحتوں سے ہے۔ عورت کمزور فریق، نازک دل اور شدید الاحساس ہونے کی وجہ سے شوہر کے صدمہ کو محسوس بھی زیادہ کرتی ہے اور حالتِ بیوگی میں وہ ہمدردی کی محتاج بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کا زمانۂ عدت زیادہ رکھا گیا ہے تاکہ شوہر کی وفات کے صدمے کے ساتھ ساتھ معاً اس کو شوہر کی ڈیوڑھی چھوڑنے کا صدمہ بھی نہ اٹھانا پڑ جائے۔ چنانچہ اسی مصلحت کے تحت آگے اسی آیت کی مزید توضیح کے طور پر ایک عارضی ہدایت یہ بھی ہوئی کہ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔۲۴۰۔ بقرہ (اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ انھیں گھر سے نکالے بغیر ایک سال تک نان و نفقہ دیا جائے۔ اور اگر وہ خود نکلیں تو جو کچھ وہ اپنے معاملے میں دستور کے مطابق کریں اس میں تم پر کوئی الزام نہیں۔ اللہ غالب اور حکیم ہے)

مذکورہ عدت گزار چکنے کے بعد وہ آزاد ہیں کہ اپنے معاملہ میں دستور کے مطابق جو قدم مناسب خیال کریں اٹھائیں۔ اس کے بعد نہ اولیاء پر کوئی الزام ہے اور نہ انھی پر کوئی الزام ہے، اگر انھوں نے معروف کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غیر شرعی رسوم کو شریعت کا درجہ دے کر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو موردِ طعن و الزام نہیں بنانا چاہیئے۔ نہ شوہر کے وارثوں اور عورت کے اولیاء کو یہ طعنہ دینا چاہیئے کہ عورت اپنے شوہر کا پورا سوگ بھی نہ منا چکی کہ وہ اس سے تنگ آ گئے اور نہ عورت کو یہ طعنہ دینا چاہیئے کہ ابھی شوہر کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ یہ شادی رچانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خدا نے جو حدود مقرر کر دیے ہیں بس انھیں کی پابندی کرنی چاہیئے اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ بندوں کے ہر عمل سے باخبر ہے۔

عورت کے لیے معروف کی پابندی کی جو شرط لگائی ہے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نکاح کے معاملے میں کفو کا بھی لحاظ ہونا چاہیئے تاکہ متعلق خاندانوں کی وجاہت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۥ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

اسلامی معاشرے میں جذبات کا احترام

اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے کے جذبات کے لحاظ و احترام کی بڑی اہمیت ہے۔ اس وجہ سے ممانعت فرمائی گئی کہ اگر کوئی انتقال کر جائے تو کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اس کی بیوہ سے اس کے زمانہ عدت ہی میں نکاح کی پینگیں بڑھانا شروع کر دے۔ اپنے ایک مرحوم بھائی کے لیے ایک حساس اور دردمند بھائی کے اندر جو جذبات ہونے چاہئیں، یہ بات اس کے بھی منافی ہے اور ایک غمزدہ بیوہ کے جذبات کا ایک شریف آدمی کو جو لحاظ ہونا چاہیئے یہ اس کے بھی خلاف ہے۔ مسلمانوں کا معاشرہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا معاشرہ ہے، جانوروں کا گلہ نہیں ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کا طالب ہو تو وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کوئی کلمہ بطورِ اشارہ زبان سے نکال دے یا اپنے دل میں نکاح کا ارادہ کر لے لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ پوشیدہ طور پر نکاح کا قول و قرار کر لے۔ بس تعزیت و ہمدردی تک بات محدود رہنی چاہیئے جو اس طرح کے حالات کے لیے معروف ہے، اگر اس ہمدردی کے سلسلہ میں کوئی کلمہ ایسا تراوش کر جائے جو غمازی کر دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ۔ بطورِ جملہ معترضہ ہے اور مقصود اس سے تنبیہ ہے کہ دلوں کے مخفی ارادوں کے متعلق یہ گمان نہ رکھو کہ یہ خدا سے مخفی رہتے ہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ تم اس ارادے کو ظاہر کرو گے، سو ظاہر کرو تو اس طرح نہ کرو کہ وہ قول و قرار اور عہد و پیمان کی شکل اختیار کر لے بلکہ اسی انداز میں ہو جو اس طرح کے حالات کے لیے پسندیدہ اور دستور کے موافق ہے۔

کتاب کا لفظ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں کسی متعین شرعی قانون کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد چار ماہ دس دن کی عدت کا وہ قانون ہے جو ایک بیوہ کے لیے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کسی خاص قانون کو کتاب کے لفظ سے تعبیر کرنا اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ فرمایا کہ جب تک قانون کی مدت پوری نہ ہو جائے اس وقت تک عقدِ نکاح کا عزم نہ کرو۔

اخیر میں اپنی صفتِ علم کا حوالہ دیا جس کی یادداشت ہی پر خدا کے قوانین کا صحیح احترام مبنی ہے۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ خدا سے ڈرتے رہو، اس کی ڈھیل سے دھوکے میں نہ پڑو، وہ غفور اور بردبار ہے اس وجہ سے درگزر کرتا ہے لیکن کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

اہلِ احسان پر ایک حق

اس آیت میں لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ کا تعلق ایک محذوف سے ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ اگر صورت

یہ ہو کہ ایک شخص اپنی منکوحہ کو اس حال میں طلاق دے کہ نہ اس نے ابھی اس کے ساتھ تعلق زن و شو قائم کیا ہو نہ اس کے لیے مہر ہی مقرر کیا ہو تو ایسی صورت میں درباب مہر اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ مہر کے بجائے اسے چاہیئے کہ وہ دستور کے مطابق اس کو کچھ دے دلا کر رخصت کرے۔ دستور کے موافق سے مراد یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی حد معیّن نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار آدمی کے معیارِ زندگی پر ہے۔ ایک غریب اپنی وسعت کے مطابق دے، امیر اپنی وسعت کے مطابق۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے کے خواہش مند ہیں اور اہلِ احسان کے زمرے میں شامل ہونا چاہتے ہیں ان پر یہ ایک حق ہے۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۲۳۷)

مرد کی فتوت کے تقاضے

یہ اوپر کی صورت سے ایک مختلف صورت بیان ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ مہر تو طے شدہ ہے لیکن طلاق ملاقات سے پہلے ہی دے دی گئی۔ ایسی صورت میں مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔ البتہ عورت اگر اپنا حق چھوڑ دے تو الگ بات ہے یا مرد اپنا حق چھوڑ دے یعنی نصف کے بجائے پورا مہر ادا کر دے۔ اگرچہ ایک محرک عورت کے لیے بھی مہر چھوڑنے کا موجود ہے کہ شوہر نے ملاقات سے پہلے ہی طلاق دی ہے لیکن قرآن نے مرد کو اکسایا ہے کہ اس کی فتوت اور مردانہ بلند حوصلگی اور اس کے درجے مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت سے اپنے حق کی دستبرداری کا خواہش مند نہ ہو بلکہ اس میدانِ ایثار میں خود آگے بڑھے۔ اس ایثار کے لیے قرآن نے یہاں مرد کو تین پہلوؤں سے ابھارا ہے۔ ایک تو یہ کہ مرد کو خدا نے یہ فضیلت بخشی ہے کہ وہ نکاح کی گرہ کو جس طرح باندھنے کا اختیار رکھتا ہے اسی طرح اس کو کھولنے کا بھی مجاز ہے، دوسرا یہ کہ ایثار و قربانی جو تقویٰ کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے وہ جنسِ ضعیف کے مقابل میں جنسِ قوی کے شایانِ شان زیادہ ہے، تیسرا یہ کہ مرد کو خدا نے اس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت پر جو ایک درجہ ترجیح کا بخشا ہے اور جس کے سبب سے اس کو عورت کا قوام اور سربراہ بنایا ہے یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کو عورت کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے وقت مرد کو بھولنا نہیں چاہیئے، اس فضیلت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہیں بلکہ اس کو دینے والا بنے۔

اس دور کے معاشرتی مفکروں کے لیے ایک تنبیہ

یہاں بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ کے الفاظ میں ایک اور نکتہ بھی ہے جو اس دور کے معاشرتی مفکروں اور مصلحوں کو خاص طور پر نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ کہ نکاح کی گرہ جس طرح مرد کے قبول سے بندھتی ہے اسی طرح اسی کی طلاق سے کھلتی ہے، گویا یہ سررشتہ اصلاً شریعت نے مرد ہی کے اختیار میں

رکھا ہے اس وجہ سے طلاق کے معاملے میں عورت کو مرد کے مساوی اختیار دینے کا رجحان، جو مغرب کی نقالی میں، ہمارے مسلمان ممالک میں بڑھتا جا رہا ہے، شریعت کے بالکل خلاف ہے اور اس سے خاندانی نظام کا شیرازہ بالکل پراگندہ ہو کر رہ جائے گا۔

۷۶۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۳۸-۲۴۲:

احکام و قوانین کا باب جو آیت ۱۶۳ سے توحید اور اس کے بعد نماز اور زکوٰۃ کے ذکر سے شروع ہوا تھا اب ان آیات پر ختم ہو رہا ہے۔ اس مجموعۂ آیات کی ترتیب اس طرح ہے کہ ایک آیت، جو اصل خاتمۂ باب کی حیثیت رکھتی ہے، خوف اور امن ہر طرح کے حالات میں نمازوں کی حفاظت سے متعلق ہے اور دو آیتوں میں بیوہ اور مطلقہ سے متعلق، جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا تھا، بعض ضمنی ہدایات ہیں جو بعد میں نازل ہوئیں۔ یہ دونوں آیتیں خاتمۂ باب کے ساتھ ملحق کر دی گئیں تاکہ کلام میں ان کی ترتیب ہی سے واضح ہو جائے کہ یہ آیات اصل احکام کے بعد بطور وضاحت نازل ہوئی ہیں چنانچہ ان کے ساتھ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ کا ٹکڑا لگا کر ان کے توضیحی آیات ہونے کی طرف اشارہ بھی فرما دیا تاکہ نظمِ کلام کے طالب کو ربطِ کلام کے سمجھنے میں کوئی زحمت نہ پیش آئے۔

نماز سارے دین کے لیے حصار ہے

گویا خاتمۂ باب کی اصل آیت حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى والی آیت ہے۔ اب اس باب کے آغاز پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ اس کے آغاز میں توحید کے ذکر کے بعد احکامِ شریعت کے سلسلہ میں سب سے پہلے آیت ۱۷۷ میں نماز اور ساتھ ہی زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے۔ یہاں دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اس باب کا خاتمہ بھی نماز ہی کے ذکر پر ہوا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دین میں جو اہمیت نماز کی ہے وہ دوسری کسی چیز کی بھی نہیں ہے۔ ساری شریعت کا قیام و بقا اسی کے قیام و بقا پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو شریعت کی اقامت اور اس کی محافظت کے لیے ایک حصار اور ایک باڑھ کی حیثیت دی ہے۔ جو شخص اس کی حفاظت کرتا ہے وہ گویا پوری شریعت کی حفاظت کرتا ہے اور جو شخص اس میں رخنے پیدا کر دیتا ہے وہ، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے، باقی دین کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کر دیتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ شروع باب میں جس نماز کا ذکر ہے وہ امن و اطمینان کے حالات کی پنج وقتہ معروف نماز ہے اور یہاں امن و اطمینان کی نماز کے علاوہ خوف و خطرے کی نماز کا بھی ذکر ہے۔ یہ نماز کے احکام کے بیان میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ ایک تدریجی ارتقا ہوا ہے۔ جس وقت باب کے آغاز کی آیتیں نازل ہوئی ہیں جنگ و جہاد کے حالات نہیں تھے لیکن تحویلِ قبلہ کے بعد سے آپ نے پڑھا کہ جنگ و جہاد کے احکام نہایت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل سلسلہ کلام جو چل

رہا تھا تو وہ جہاد اور انفاق ہی کا تھا، دوسرے مسائل تو، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، ضمناً پیدا ہو گئے ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی متقاضی ہوئی کہ امن کی نماز کے ساتھ خوف اور خطرے کی نماز کا بھی ذکر کر دیا جائے چنانچہ پہلی صورت کی نماز کا ذکر اقامتِ صلوٰۃ کے لفظ سے کیا ہے اور اس دوسری حالت کی نماز کا ذکر محافظت علی الصلوات کے الفاظ سے فرمایا۔ بیان کے ان دونوں اسلوبوں میں شدتِ اہتمام کا جو فرق نمایاں ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہو سکتا۔

یہ بات کہ نماز پورے دین کے لیے بمنزلہ حصار اور شہر پناہ ہے اگرچہ قرآن میں تدبر کرنے والوں سے مخفی نہیں ہو سکتی، اس کے شواہد و نظائر قرآن میں بہت ہیں، لیکن ممکن ہے، ایک عام قاری کو یہ شبہ ہو کہ یہاں ہم نے ربطِ کلام جوڑنے میں تکلف سے کام لیا ہے اس وجہ سے ہم سورہ مومنون کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اس ربطِ کلام کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔ فرمایا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ	ان اہلِ ایمان نے فلاح پائی جو اپنی نمازوں
صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ	میں خشوع کرنے والے ہیں، جو لغو سے منہ
عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ	موڑنے والے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں،
لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ	جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں،
لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	مگر اپنی بیویوں یا لونڈیوں سے، سو اس بارے
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ	میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو اس سے
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	آگے بڑھے تو وہ لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں،
الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ	اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى	کرنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی برابر
صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۱-۹۔ مومنون)	نگہداشت رکھتے ہیں۔

ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کا آغاز نماز سے ہوا ہے اور پھر دین و اخلاق کی چند بنیادی باتیں بیان کرنے کے بعد ان کا خاتمہ بھی نماز ہی پر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں پہلی نماز کے ساتھ خشوع کا ذکر ہے جو نماز کی اصل روح ہے اور اس دوسری نماز کے ساتھ محافظت کا حوالہ ہے جو اس کے تمام ظاہری اہتمام کی ایک جامع تعبیر بھی ہے اور جس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ درحقیقت نمازوں کی حفاظت ہی ہے جو دین کی دوسری باتوں کی حفاظت کی ضامن ہے۔

بالکل اسی طرح کا نظم سورۂ معارج کی مندرجہ ذیل آیات میں بھی ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ	بے شک انسان جلد باز پیدا ہوا ہے، جب
الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ	اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے گھبرا اٹھتا ہے

مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ	اور جب اس کو بھلائی پہنچتی ہے تو بخیل بن جاتا
عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ	ہے، صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو اپنی
فِىْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ	نمازوں پر قائم و دائم رہنے والے ہیں، جن کے
وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ	مالوں میں سائلوں اور محروموں کا ایک معیّن حق
بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ	ہے، جو روزِ جزا کی تصدیق کرتے ہیں اور جو
عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ اِنَّ عَذَابَ	اپنے رب کے عذاب سے برابر ڈرتے رہنے والے
رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ	ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب بے خوف
لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	رہنے کی چیز نہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ	کرنے والے ہیں مگر اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے سو
مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ	ان کے باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں البتہ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ	جو اس حد سے آگے قدم بڑھائیں تو وہ لوگ حد
لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَ	سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور
الَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝	اپنے عہد کا پاس کرنے والے ہیں اور جو اپنی شہادتوں
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ	کے قائم کرنے والے ہیں اور جو اپنی نماز کی برابر نگہداشت
يُحَافِظُوْنَ ۝ (۱۹-۳۴ معارج)	رکھتے ہیں۔

یہاں بھی دیکھیے نماز ہی سے آغاز اور نماز ہی پر اختتام ہے۔ جس طرح ایک شہر پناہ پورے شہر کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہوتی ہے اسی طرح نماز دوسری تمام نیکیوں کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے اور مقصود اس سے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ سارے دین کی محافظ نماز ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی اس نے سارے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کیا اس نے سارے دین کو ضائع کیا۔

بالکل اسی اصول پر سورہ بقرہ میں بھی اس پورے باب کو جو احکام و قوانین سے متعلق ہے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے نماز کے حکم سے گھیر دیا ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۳۸-۲۴۲

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾
فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٢٤٢﴾ ع ۳۱ ۱۵

ترجمہ آیات ۲۳۸-۲۴۲

نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور پر بیچ کی نماز کی اور نمازوں میں خدا کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہو۔ اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل یا سوار جس صورت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو، پھر جب خطرہ دور ہو جائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے، جس کو تم نہیں جانتے تھے۔ ۲۳۸-۲۳۹

اور جو تم میں سے وفات پائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں وہ اپنی بیویوں کے لیے سال بھر کے نان نفقے کی گھر سے نکالے بغیر وصیت کر جائیں۔ اگر وہ خود گھر چھوڑیں تو جو کچھ وہ اپنے باب میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ۲۴۰

اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق کچھ دینا دلانا ہے، یہ خدا سے ڈرنے والوں پر حق ہے۔ ۲۴۱

اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کی تمہارے لیے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ۲۴۲

۷۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (۲۳۸)

نماز کی محافظت

نماز کی محافظت میں ان تمام چیزوں کی نگہداشت اور ان کا اہتمام شامل ہے جو اس کے لوازم و شرائط اور اس کے آداب و ارکان سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان چیزوں کا ذکر کتاب کے شروع میں کر چکے ہیں۔ یہاں اقامت کی جگہ محافظت کا لفظ جس نئے پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ مشکل اور پُر خطر حالات میں بھی، ہر طرح کے خطرات کا مقابلہ کر کے، اس کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں صلوٰۃ الخوف کا ذکر بھی ہے جس سے واضح ہے کہ تلواروں کی چھاؤں میں بھی جس چیز کو مومن نہیں بھولتا ہے، وہ یہی ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن تمھاری یاد سے غافل نہیں رہا

'صلوٰۃ وسطیٰ' سے مراد

'اَلصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى' کے لغوی معنی تو بیچ والی نماز کے ہیں اور اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس خاص سے کیا مراد ہے تو اس کے جواب میں اہل تاویل نے بڑا اختلاف کیا ہے۔ زیادہ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ ہمارا اپنا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے۔ یہ نماز ہماری شب و روز کی تقسیم میں ایک ایسی نماز کی حیثیت رکھتی ہے جو رات اور دن دونوں کی سرحد پر واقع ہو۔ سرحد پر تو کہہ سکتے ہیں کہ فجر کی نماز بھی واقع ہے لیکن جس سرحد پر عصر کی نماز واقع ہے وہ عام حالات میں بھی پُر خطر ہے اور اگر حالات جنگ کے ہوں تب تو یہ بہت ہی پر خطر بن جاتی ہے۔ عام حالات میں دیکھیے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ چونکہ عصر کے وقت دن کی تمام سرگرمیاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو رہی ہوتی ہیں اس وجہ سے دنیا طلبوں کے لیے یہ بڑی آپا دھاپی کا وقت ہوتا ہے، مسافر رات آنے سے پہلے منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، دکاندار دکان بڑھانے سے پہلے کچھ کمائی کر لینے کی دھن میں ہو جاتا ہے، نوکر اپنی مقررہ ڈیوٹی کے سرانجام دینے کے چکر میں پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ میدانوں میں کھلاڑی بھی اپنے آخری داؤں اور اپنی آخری بازی کے منصوبوں میں ایسے غرق ہوتے ہیں کہ کسی کو کسی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں رہ جاتا۔

اب اسی پر قیاس کیجیے کہ اگر خدا نخواستہ حالات جنگ کے ہو جائیں تو پھر یہ آپا دھاپی کتنی بڑھ سکتی ہے، خاص طور پر دن کے اس حصے میں جس میں عصر کی نماز واقع ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے عام نمازوں کی نگہداشت کا بھی حکم دیا اور ساتھ ہی عصر کی نماز کی نگہداشت کے لیے

خاص طور پر تاکید فرمائی۔

رہا یہ سوال کہ اگر مقصود عصر کی نماز ہی تھی تو اس کو صاف صاف عصر کے لفظ ہی سے کیوں نہیں تعبیر کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے اس نماز کا وہ نازک جائے وقوع ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کے سبب سے یہ خاص نگہداشت کی محتاج ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہی نماز ہے جس کے بارے میں حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے دو نبیوں کو ابتلا پیش آیا۔ ایک حضرت سلیمان علیہ السلام کو فوجی پریڈ کے موقع پر، دوسرے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ احزاب کے موقع پر۔

"قنت" کے معنی خضوع اور تذلل کے ہیں۔ یہاں اس کا موقع ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ نماز کی محافظت کے حکم میں نماز کا یہ ادب بھی داخل ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۹)

صلوٰۃ الخوف سے مراد

رجال، راجل کی اور رکبان، راکب کی جمع ہے۔ فرمایا کہ اگر دشمن نے حالت خطرے کی پیدا کر رکھی ہو، نماز اپنے تمام شرائط و آداب کے ساتھ ادا کرنی ممکن نہ ہو تو سوار پیادہ جس حال میں ہو اسی حال میں نماز ادا کرلو۔ خطرے کے حالات میں نماز کی محافظت یہی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ وہ شکل بھی بتا دی گئی ہے جو خطرے کے حالات میں نماز باجماعت کے قیام کے لیے اختیار کی جاسکتی ہے اگر اس کا امکان ہو۔

پھر فرمایا کہ جب امن کے حالات میسر ہوں تو اس طرح اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا ہے۔ اللہ کو یاد کرو سے مراد ادائیگی نماز ہے۔ ذکر کا لفظ نماز کے لیے قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ نماز کی اصل حقیقت چونکہ ذکر ہی ہے اس وجہ سے کبھی کبھی اصل حقیقت سے اس کی شکل بھی تعبیر کر دی جاتی ہے تاکہ شکل اختیار کرتے وقت آدمی کی نظر اصل روح پر رہے، صرف شکل پر جم کر نہ رہ جائے۔

پیغمبر کی تعلیم عین اللہ کی تعلیم ہے

"كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ" سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم عین اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں نماز کا حکم تو ہوا ہے لیکن اس کے ادا کرنے کا طریقہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے، یہ چیز صرف پیغمبر کی تعلیم سے امت کو معلوم ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود فرمایا کہ "جیسا کہ اس نے تعلیم دی"۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر پیغمبر کی تعلیم عین اللہ کی تعلیم نہیں ہے تو وہ کیا چیز ہے جس کو یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیم سے تعبیر فرمایا ہے۔

ہم آیت وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور کہ وہ صرف قرآن سنا دینے کے لیے تشریف لائے تھے بنیادی طور پر غلط ہے۔

آپ قرآن سنانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر بھی مامور تھے کہ لوگوں کو قرآن پڑھائیں اور سکھائیں اور اس کے مضمرات واشارات اور اس کی حکمتیں اور اس کے اسرار اچھی طرح واضح کردیں۔ اس کام پر آپ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مامور تھے اس وجہ سے ایک معلم کی حیثیت سے آپ نے اُمت کو جو کچھ بتایا سکھایا وہ سب آپ کے فریضۂ نبوت ہی کے تحت ہے۔ تعجب ہے کہ ان واضح آیات کی موجودگی میں بھی بعض لوگ نماز کے اوقات اور اس کی رکعات وغیرہ سے متعلق بے سروپا بحثیں اٹھاتے ہیں۔

'مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ' کے الفاظ بطور اظہار فضل واحسان کے ہیں۔ امی عربوں پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہوا تھا کہ ان پر اس نے دین وشریعت کے وہ اسرار کھولے جو نہ ان پر کھلے تھے اور نہ ان کے اگلوں پر کھلے تھے اور نہ کسی اور ہی پر کھلے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس فضل واحسان کا جواب ان کی طرف سے یہی زیبا ہے کہ اس کی قدر کریں، بنی اسرائیل کی طرح اس کی ناقدری نہ کریں۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۴۰)

وصیت کا لفظ فعل محذوف کا مفعول ہے۔ متاعاً وصیت کا مفعول ہے اور غیر اخراج ہمارے نزدیک لازواجھم سے حال پڑا ہوا ہے۔ ترجمے میں ہم نے یہ ترکیب کلام واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر نہ واضح ہوسکی ہو تو اس کو ہماری کوتاہی پر محمول کیجیے۔ تالیف کلام بہر حال ہمارے خیال میں یہی درست ہے۔

بیوہ کے لیے وصیت کا عارضی حکم

اوپر آیت ۲۳۴ میں بیوہ عورتوں کی عدت بیان ہوئی ہے۔ انہی سے متعلق بعد میں یہ مزید ہدایت اوپر والی آیت ہی کی توضیح مزید کے طور پر نازل ہوئی کہ بیوائیں چھوڑ جانے والے شوہر اپنی بیواؤں کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور اپنے گھروں میں سکونت کی اجازت کی وصیت کر جائیں۔ اگر اس دوران میں بیوہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑے اور اپنے نکاح ثانی یا اپنی سکونت کے سلسلہ میں دستور کے مطابق کوئی قدم اٹھائے تو اس کا اس کو حق حاصل ہے۔ میت کے ورثا کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ وصیت کی خلاف ورزی کریں۔

اس وصیت کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ ان آیات کے نزول کے زمانے تک میراث کا قانون ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اسی باب کے شروع میں (آیت ۱۸۰) والدین اور قرابت داروں کے لیے بھی وصیت کی ہدایت گزر چکی ہے اور ہم وہاں بیان کرچکے ہیں کہ یہ حکم عارضی طور پر اس وقت تک کے لیے دیا گیا تھا جب تک سورۂ نساء والا قانون وراثت نازل نہیں ہوا تھا۔ اسی قانون کے تحت بیوگان سے متعلق بھی یہ ہدایت ہوئی کہ ان کے لیے ایک سال کے نان نفقہ اور سکونت کی وصیت کردی جائے۔ ظاہر ہے کہ بعد میں جب وراثت کا قانون جاری ہوگیا اور مورث کے دوسرے وارثوں کی طرح اس کی بیوہ یا بیوگان کا حصہ بھی شریعت میں معین ہوگیا تو جس طرح والدین اور دوسرے وارثوں سے متعلق وصیت

کی مذکورہ ہدایت منسوخ ہوگئی، بیوگان کے لیے بھی یہ منسوخ ہوگئی اور اس کی جگہ وراثت کے مستقل قانون نے لے لی۔

اگر یہ آیت اوپر والی آیت یعنی آیت ۲۳۴ کے ساتھ ہوتی جس میں بیوہ کی عدت مذکور ہوئی ہے تو اس کا نظم سمجھنے میں کسی کو زحمت نہ ہوتی لیکن اس صورت میں یہ بات نہ واضح ہوسکتی کہ یہ آیت پہلے حکم کے بعد اسی حکم کی توضیح کے طور پر نازل ہوئی ہے، حالانکہ احکام کی تدریج اور ان کی حکمتیں سمجھنے کے لیے یہ چیز ضروری ہے۔ اسی حکمت کے لیے اس آیت کو اور اس کے ساتھ والی آیت کو، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، خاتمہ باب پر رکھ دیا اور یہ اشارہ کر دیا کہ یہ بعد میں نازل ہونے والی توضیحات ہیں۔

عزیز وحکیم کی صفات خدا کے حق قانون سازی اور اس کے قانون کے پُرحکمت ہونے کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہیں اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کی طرف بھی۔ اسلام میں تمام دین وشریعت اور تمام امر ونہی کی بنیاد خدا کی صفات ہی پر ہے۔ اس وجہ سے کہیں بھی ان کو محض برائے بیت نہیں خیال کرنا چاہیئے بلکہ ہر جگہ ان پر اسلام کے فلسفۂ قانون اور فلسفۂ اخلاق کی بنیاد کی حیثیت سے غور کرنا چاہیئے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۴۱-۲۴۲)

صفات پر مبنی حقوق کا درجہ

اوپر آیت ۲۳۶ میں مطلقہ عورتوں کو دے دلا کر رخصت کرنے کی جو ہدایت فرمائی تھی آخر میں یہ پھر اس کی یاد دہانی کر دی اور اس کو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا۔ جو حقوق صفات وکردار پر مبنی ہوتے ہیں بعض حالات میں وہ اس دنیوی زندگی میں تو قانون کی گرفت کے دائرے سے باہر ہوتے ہیں لیکن خدا کے ہاں ان صفات کے لیے وہ حقوق ہی معیار ٹھہریں گے۔ اگر ایک چیز مومنین یا محسنین یا متقین پر حق قرار دی گئی ہے تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ اسلام کا قانون اس دنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آخرت میں بھی ان کی خلاف ورزی پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوگا۔ آخرت میں آدمی کا ایمان یا احسان یا تقویٰ انھی حقوق کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کے اعتبار سے وزن دار یا بے وزن ٹھہرے گا۔

آخری آیت میں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ الآیۃ کا ٹکڑا بطور اظہار احسان ہے اور اس سے، جیسا کہ ہم دوسری جگہوں پر واضح کر چکے ہیں، ان آیات کی نوعیت واضح ہوتی ہے جن کی طرف كَذٰلِكَ کا اشارہ ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عموماً یہ ٹکڑا ان آیات کے بعد آتا ہے جن کی حیثیت توضیح مزید کی ہوتی ہے اور جو اپنے باب کے اصل احکام کے بعد لوگوں کے اندر سوال یا مزید جستجو اور تلاش پیدا ہونے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ نظم قرآن کے طالبوں کو بہت سے مقامات میں ان سے بڑی قیمتی رہنمائی ملتی ہے اس وجہ سے ان کو نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔

قرآن نے اجمال کے بعد تفصیل، ایجاز کے بعد توضیح اور توضیح کے بعد توضیح مزید کا یہ طریقہ جو اختیار کیا ہے اس میں تربیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ ازاں جملہ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے دین میں غور و فکر اور اس کے فوائد و مصالح اور اس کے اسرار و حکم تک پہنچنے کے لیے ہماری عقل کی تربیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تدریج کو نمایاں کر کے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرماتا ہے کہ ہم دین میں عقل کو کس طرح استعمال کر سکتے ہیں اور پیش آنے والے حالات و معاملات میں ان کلیات سے کس طرح جزئیات مستنبط کر سکتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

۷۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۴۳-۲۵۳

پیچھے کے سلسلۂ مضمون کی طرف اشارہ

یہاں ذرا پیچھے مڑ کر سلسلۂ کلام کو ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے۔ فصل ۴۸ میں ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ اصل بیان توبیت اللہ کے تعلق سے جہاد و انفاق کا ہو رہا تھا لیکن انفاق کی بحث نے یتیموں کی صلاح فلاح اور ان کی ماؤں کے ساتھ نکاح کا سوال سامنے کر دیا اور اس طرح نکاح و طلاق سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لیے ایک تقریب پیدا ہو گئی۔ قرآن کا طریقہ یہی ہے کہ جب کسی مسئلے کے بیان کے لیے تقریب پیدا ہو جاتی ہے تو اصل سلسلۂ بیان کو روک کر، اس مسئلے سے متعلق اتنی باتیں بیان کر دیتا ہے جتنی باتوں کے لیے وقت کے حالات تقاضا کر رہے ہوتے ہیں اور پھر اصل سلسلۂ بیان شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ نکاح و طلاق سے متعلق مناسب وقت مسائل بیان کر چکنے کے بعد اصل بیان جہاد و انفاق کا پھر شروع ہو گیا۔

آگے کے مضامین کا خلاصہ اور ان کا نظم

آگے کے مطالب کی ترتیب یوں ہے کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ وہ ایک بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں کے ڈر سے اپنا وطن چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے اور اس طرح انھوں نے اپنے لیے اخلاقی اور سیاسی موت اختیار کر لی۔ اس واقعے کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ انھوں نے مکہ سے مدینہ کو جو ہجرت کی ہے تو یہ موت اور دشمن سے فرار نہیں ہے بلکہ کفر اور فتنہ سے فرار ہے اور اصل مقصد اس سے جانیں بچانا نہیں بلکہ اللہ کے دین کی نصرت اور اس کی راہ میں جہاد کے لیے منظم ہونا ہے۔

اس تمہید کے بعد مسلمانوں کو جہاد و انفاق پر ابھارا ہے اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کی اس جنگ کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کی تحریک ان کے ہاں بھی بعینہٖ اسی مقصد کے لیے ہوئی تھی جس مقصد کے لیے مسلمانوں کو یہاں جہاد پر ابھارا جا رہا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل نے بھی یہ جنگ اپنے قبلہ کی آزادی کے لیے لڑی تھی اور مسلمان بھی اپنے قبلہ ہی کی آزادی کے لیے اٹھ رہے تھے۔

بنی اسرائیل اپنی اس جنگ کے مختلف مراحل میں جن آزمائشوں سے گزرے اور جن فتنوں میں مبتلا

ہوئے وہ بڑے ہی سبق آموز تھے اس وجہ سے مسلمانوں کو جو بعینہٖ انھی مراحل سے گزرنے کے لیے کمربستہ ہو رہے تھے، ان کی سرگزشت کا یہ حصہ سنا دینا ضروری تھا تاکہ مسلمان اس سے سبق حاصل کریں اور ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچا سکیں جو آگے کے مراحل میں پیش آسکتے ہیں۔

اس کے بعد چند آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اس سرگزشت کے ذکر سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمھارے سامنے بھی آنے والا ہے اور اس سے تمھاری نبوت کی تصدیق ہوگی لیکن بنی اسرائیل خود اپنے آئینے میں بھی تمھاری تصویر دیکھ لینے کے باوجود اسی طرح اپنی ضد اور مخالفت پر اڑے رہیں گے، سو ان کی مخالفت کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے خدا تمھاری نصرت فرمائے گا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۴۳-۲۵۳

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى

وقف لازم

يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ
لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ
وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ
مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ
بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا
ع ۳۲ ۱۶
فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ
مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا
لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ
فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا
لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۛ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ

بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

الجزء ۳ — ع ۳۳

ترجمۂ آیات ۲۵۳-۲۴۳

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے تو اللہ نے ان کو کہا کہ جاؤ مر جاؤ، پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا، اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ ۲۴۳

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور یہ خوب سمجھ رکھو کہ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے اور کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ اللہ اس کو اس کے لیے کئی گنا بڑھائے۔ اللہ ہی ہے جو تنگ دستی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی دیتا ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا بھی ہے۔ ۲۴۴-۲۴۵

کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا جب کہ موسیٰ کے بعد انھوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک امیر مقرر کر دیجیے کہ ہم خدا کی راہ میں

جہاد کریں۔ اس نے کہا، ایسا نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کر دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو۔ وہ بولے کہ بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور بچوں سے نکالے گئے ہیں۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان کی ایک قلیل تعداد کے سوا سب منہ موڑ گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ اللہ نے تمھارے لیے طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے۔ وہ بولے کہ بھلا اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس سے زیادہ حق دار ہم اس امارت کے ہیں اور اسے تو مال کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے۔ نبی نے کہا اللہ نے تمھاری سرداری کے لیے اسی کو چنا اور اس کو علم اور جسم دونوں میں کشادگی عطا فرمائی ہے۔ اللہ اپنی طرف سے جسے چاہے اقتدار بخشے، اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی امارت کی نشانی یہ ہے کہ تمھارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمھارے رب کی طرف سے سامانِ تسکین اور آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس میں تمھارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔ ۲۴۶ - ۲۴۸

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انھوں نے بتایا کہ اللہ ایک ندی کے ذریعہ سے تمھاری جانچ کرنے والا ہے تو جو اس میں سے پی لے گا وہ میرا ساتھی نہیں اور جو اس کو نہیں چکھے گا تو بے شک وہ میرا ساتھی ہے، مگر یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ تو انھوں نے اس میں سے خوب پیا، صرف ان میں سے تھوڑے لوگ اس سے بچے۔ پھر جب طالوت اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان پر ثابت قدم رہے دریا پار کر گئے تو

یہ لوگ بولے کہ اب ہم میں تو جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ جو لوگ یہ گمان رکھتے تھے کہ بالآخر انھیں اللہ سے ملنا ہے انھوں نے للکارا کہ کتنی چھوٹی جماعتیں رہی ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں، اللہ تو ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو انھوں نے دعا کی، اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر انڈیل دے، ہمارے قدم جمائے رکھ، اور کافر قوم پر ہمیں غلبہ عطا فرما۔ تو اللہ کے حکم سے انھوں نے ان کو شکست دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اس کو بادشاہی اور حکمت بخشی اور اس علم سے اس کو سکھایا جس میں سے وہ چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ۲۴۹ - ۲۵۱

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں سناتے ہیں مقصد کے ساتھ اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا، اور بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح دلائل کے بعد نہ لڑتے لیکن انھوں نے اختلاف کیا، سو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ اختلاف نہ کرپاتے لیکن اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ۲۵۲ - ۲۵۳

۷۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ، فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۲۴۳)

'الم تر' کے خطاب کی نوعیت

"اَلَمْ تَرَ" کا خطاب ضروری نہیں کہ واحد کے لیے ہو بلکہ یہ عموماً، جیسا کہ استاذ امامؒ نے سورہ فیل کی تفسیر میں واضح کیا ہے، جمع کے لیے آتا ہے اور خطاب اس میں گویا مخاطب گروہ کے ہر شخص سے فرداً فرداً ہوتا ہے۔ اس کے بعد جس واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یا تو مخاطب گروہ کا عینی شاہد ہوتا ہے یا واقعے کی شہرت اس درجے کی ہوتی ہے کہ اس کی نسبت یہ باور کیا جاتا ہے کہ اس سے مخاطب باخبر ہیں یا انھیں باخبر ہونا چاہیے۔ یا متکلم کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ واقعے کی صداقت ایسی مسلّم ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

الفاظ 'موت' 'حیات' کا مفہوم

موت کے لفظ پر اسی سورہ کی آیت ۵۶ کے تحت ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ جس طرح زندگی کے فنا ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے اسی طرح نیند، بے ہوشی اور اخلاقی و ایمانی موت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ وہاں ہم نے لسان العرب کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں قرآن کے بعض نظائر ملاحظہ ہوں۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ۴۲۔ زمر (اللہ جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی نیند کے وقت) ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۵۶۔ بقرہ (پھر ہم نے تمھاری بے ہوشی کے بعد تم کو اٹھایا تاکہ تم شکر کرو) اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ۸۰۔ نمل (تم اپنی دعوت مردہ دلوں اور بہروں کو نہیں سنا سکتے) اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ ۱۲۲۔ انعام (کیا وہ جو مردہ دل تھا تو ہم نے اس کو حیات ایمانی بخشی اور اس کو نور ہدایت عطا کیا جس کو لے کر لوگوں کے درمیان چلتا ہے)

اسی طرح حیات کا لفظ بھی مادی زندگی سے لے کر نیند سے بیداری اور ایمانی و اخلاقی زندگی تک سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک واضح نظیر تو انعام کی مقدم الذکر آیت ہی میں موجود ہے، دوسری واضح تر نظیر انفال سے ملاحظہ ہو۔ اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۲۴۔ انفال (اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ تمھیں بلاتا ہے اس چیز کی طرف جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے)

'اَلَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ' کے واقعہ کا مصداق

اس آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کا تعلق بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دور سے ہے جس کا ذکر صحیفۂ سموئیل میں ہے۔ سموئیل نبی کے ظہور کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل سخت انتشار میں مبتلا تھے، اگرچہ تعداد کے لحاظ سے یہ اس وقت تین لاکھ سے زیادہ تھے، جیسا کہ سموئیل

ہیں تصریح ہے، لیکن بدعات اور شرک کے غلبے کی وجہ سے ان کی مذہبی و اخلاقی حالت بھی بڑی خراب تھی اور اجتماعی تنظیم مفقود ہونے کی وجہ سے سیاسی حالت بھی بڑی ابتر تھی۔ ہر طرف سے دشمنوں کی یورش تھی اور یہ ان سے اس قدر مرعوب اور دہشت زدہ تھے کہ کسی سے مقابلے کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ خاص طور پر فلسطینیوں نے ان کو بری طرح مرعوب کر لیا تھا۔ انھوں نے ان پر چڑھائی کر کے ان کا قتل عام بھی کیا اور ان سے خدا کا وہ صندوق بھی چھین لے گئے جس کی حیثیت ان کے ہاں بالکل قبلہ کی تھی، جس کو وہ اپنی تمام عبادات اور تمام مہمات میں آگے آگے رکھتے تھے۔ ان کے ڈر سے بنی اسرائیل نے اپنے عقرون سے لے کر جات تک کے سارے شہر بھی خالی کر دیئے تھے۔[1] خوف و بزدلی کی یہ مدت ان پر بیس برس طاری رہی۔ اس کے بعد سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کا کام شروع کیا، ان کو شرک و بدعت سے توبہ کرنے اور اپنے انتشار کو دور کر کے از سر نو منظم و متحد ہونے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی بخشی اور اس طرح بنی اسرائیل میں بیس سال کی مردنی کے بعد از سر نو ایمانی و سیاسی زندگی کی حرکت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ہوئے کہ فلسطیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور اپنے ان شہروں کو ان سے واپس لے سکیں جن کو خود خالی کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

سموئیل میں یہ داستان بہت پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کے کچھ ضروری حصے یہاں نقل کرتے ہیں جن سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

فلسطیوں سے بنی اسرائیل کی مرعوبیت، ان کے ہاتھوں ان کے قتل عام اور خدا کے صندوق کے چھن جانے کا ذکر اس طرح ہوا۔

> "اور فلستی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔" سموئیل باب ۴: ۱۰-۱۱

خدا کے صندوق کے چھن جانے کا جو اثر بنی اسرائیل پر پڑا اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

> "اس خبر لانے والے نے جواب دیا اسرائیلی فلستیوں کے آگے سے بھاگے اور لوگوں میں بڑی خونریزی ہوئی اور تیرے دونوں بیٹے حفنی اور فینحاس بھی مر گئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا تو وہ کرسی پر سے پچھاڑ کھا کر پھاٹک کے کنارے گرا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی . . . .
>
> . . . . اور کہنے لگی کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی اس لیے کہ خدا کا صندوق

---

[1] سموئیل باب ۹   [2] سموئیل باب ۴: ۱   [3] سموئیل باب ۲

چھن گیا تھا اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے سو اس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی
کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے۔" سموئیل باب ۴ ۔ ۱۷ - ۲۲

اس حادثہ کے بعد بنی اسرائیل پر پورے بیس سال تک خوف و بزدلی اور نوحہ و ماتم کی جو مردنی طاری رہی اور پھر سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کی جو دعوت بلند کی اس کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

" اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہو گئی یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عستارات کو اپنے بیچ سے دور کرو اور خداوند کے لیے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو اور وہ فلستیوں کے ہاتھ سے تمھیں رہائی دے گا۔ تب بنی اسرائیل نے بعلیم اور عستارات کو دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے۔ پھر سموئیل نے کہا کہ سب اسرائیل کو مصفاہ میں جمع کرو اور میں تمھارے لیے خداوند سے دعا کروں گا۔"
سموئیل باب ۷ ۲-۶۔

اس اجتماعی توبہ و استغفار اور تنظیم و اتحاد کے بعد بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور ان کو شکست دے کر ان سے اپنے چھنے ہوئے شہر اور ساتھ ہی اپنی چھنی ہوئی حشمت واپس لے سکیں۔ بنی اسرائیل کی اس نئی زندگی کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

" اور سموئیل بنی اسرائیل کے لیے خداوند کے حضور فریاد کرتا رہا اور خداوند نے اس کی سنی اور جس وقت سموئیل اس سوختنی قربانی کو گزران رہا تھا اس وقت فلستی اسرائیلیوں سے جنگ کرنے کو نزدیک آئے لیکن خداوند فلستیوں کے اوپر اس دن بڑی کڑک کے ساتھ گرجا اور ان کو گھبرا دیا اور انھوں نے اسرائیلیوں کے آگے شکست کھائی اور اسرائیل کے لوگوں نے مصفاہ سے نکل کر فلستیوں کو رگیدا اور بیت کر کے نیچے تک انہیں مارتے چلے گئے ...... سو فلستی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی سرحد میں پھر نہ آئے اور سموئیل کی زندگی بھر خداوند کا ہاتھ فلستیوں کے خلاف رہا اور عقرون سے جات تک کے شہر جن کو فلستیوں نے اسرائیلیوں سے لے لیا تھا وہ پھر اسرائیلیوں کے قبضہ میں آئے اور اسرائیلیوں نے ان کی نواحی بھی فلستیو کے ہاتھ سے چھڑا لی۔" سموئیل باب ۷۔ ۱۰ - ۱۴

ہمارے نزدیک تاریخ بنی اسرائیل کا یہی جزو ہے جس کی طرف آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جب انھوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس ایمانی و اخلاقی موت کے حوالہ کر دیا جس کی تعبیر مُوْتُوْا سے فرمائی ہے۔ یہ معاملہ ٹھیک ٹھیک اس سنت اللہ کے مطابق ہوا جس کی طرف فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی جب انھوں نے گمراہی پسند کی تو اللہ نے ان کو گمراہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر جب ان کے اندر تجدید و احیائے ملت کی دعوت اٹھی اور

انھوں نے از سرِنو ایمان و اسلام کی حیات تازہ اختیار کرلینے کا عزم کرلیا تو اللہ نے ان کو از سرِ نو زندہ و متحرک کردیا۔ اسی چیز کو یہاں ثُمَّ اَحْیَاھُمْ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اسی اصول پر ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے لیے ذلت و نامرادی کو پسند کرتی ہے تو خدا اس کو ذلت و نامرادی کے حوالہ کردیتا ہے اور اگر کوئی قوم عروج و سربلندی کی طالب ہوتی ہے اور اس طلب کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کی ہمت دکھاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو عزت و سربلندی بخشتا ہے اور یہ مرتبہ دے کر اس کا امتحان کرتا ہے۔

واقعہ کے ذکر کا مقصد

اس واقعہ کے ذکر سے مقصود مسلمانوں خصوصاً کمزور مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد و انفاق پر ابھارنا ہے، گویا یہ اس مضمون کی تمہید ہے جو آگے کی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ہم تمہیدوالی فصل میں اشارہ کر آئے ہیں کہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بھی ان کے قبلہ کی جنگ سے متعلق ہے اور مسلمانوں کو بھی یہاں جس جنگ اور جس انفاق کے لیے ابھارا جا رہا ہے اس کا تعلق اصلاً قبلہ ہی کی آزادی سے ہے۔ دونوں میں نہایت واضح قدرِ مشترک موجود ہے۔ گویا مسلمانوں کے سامنے بھی اس وقت زندگی اور موت دونوں کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اگر وہ موت سے ڈر گئے تو یاد رکھیں کہ ان کو موت سے کوئی چیز بھی بچا نہ سکے گی۔ ان کے اوپر ذلت و خواری اور نفاق کی موت طاری ہو کر رہے گی اور اگر وہ موت سے بے پروا ہو کر زندگی کی راہ پر بڑھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ ان کو دنیا میں ایمان و اسلام کی باعظمت زندگی اور آخرت میں فوز و فلاح کی حیاتِ جاوداں سے سرفراز فرمائے گا۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۴۴)

جہاد کے لیے دو محرک

اوپر کی تاریخی تمہید کے بعد یہ مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا ہے۔ اور اس ابھارنے کے لیے دو محرک یہاں نمایاں فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جنگ اللہ کی راہ میں ہے، نفس یا شیطان کی راہ میں نہیں ہے اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر بندے کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے، تمہاری جانبازیاں اور قربانیاں، تمہاری دعائیں اور فریادیں، تمہارے دشمنوں کی چالیں اور تدبیریں سب اس کے علم میں ہیں اس وجہ سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ

مرگئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی

ظاہر ہے کہ ان صفات کا حوالہ دینے سے مقصود یہاں اس کا لازم ہے یعنی جب اللہ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہاری پکار پر تمہاری مدد و نصرت فرمائے گا اور تمہاری جانبازیوں کا تمھیں بھرپور صلہ دے گا۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۴۵)

انفاق کے لیے قرض کی تعبیر

جانی قربانی کی دعوت کے بعد یہ مالی قربانی کی دعوت ہے اور اس کے لیے جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ غایت درجہ مؤثر ہے۔ اوّل تو سوال کا یہ انداز ہی کہ کون ہے جو خدا کو قرض دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے! غایت درجہ شوق انگیز ہے، پھر یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو "قرض دینے" سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرض، قرضدار کے ذمہ واجب ہوتا ہے اور یہ رب کریم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جو مال اس نے خود بندوں کو عنایت فرمایا ہے وہی مال وہ جب ان سے اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس کو اپنے ذمہ قرض ٹھہراتا ہے یعنی اس کی واپسی از خود اپنے ذمہ واجب قرار دیتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ روح و دل کو بے خود کر دینے والی بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ رب کریم یہ قرض اس لیے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کے دیئے ہوئے خزف ریزوں کو خوب بڑھائے اور ان کو بڑھا کر ایک لازوال خزانہ کی شکل میں ان کو واپس کرے۔ یعنی اس قرض کی ضرورت اس لیے نہیں پیش آئی ہے کہ خدا کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے، اس کا خزانہ بھرپور اور وہ بالکل بے نیاز و بے پروا ہے، البتہ اس کی کریمی نے اپنے بندوں کے لیے نفع کمانے کی یہ راہ کھولی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک خرچ کر کے دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک اس کا اجر حاصل کر لیں۔

"قرض حسن" کا مفہوم

اس قرض کے متعلق شرط صرف ایک لگائی ہے۔ وہ یہ کہ یہ قرض "قرض حسن" ہو۔ قرض حسن کا مفہوم قرآن کے دوسرے مواقع سے جو نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دل کی تنگی کے ساتھ محض چھدا اتارنے کے لیے نہ دیا جائے بلکہ پوری فراخدلی اور حوصلے کے ساتھ دیا جائے، ریا اور نمائش کے لیے نہ دیا جائے بلکہ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے دیا جائے، کسی دنیوی طمع کے حصول کی غرض سامنے رکھ کر نہ دیا جائے بلکہ صرف آخرت کے اجر کی خاطر دیا جائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حقیر، کم وقعت اور ناجائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال میں سے نہ دیا جائے بلکہ محبوب، عزیز اور پاکیزہ کمائی میں سے دیا جائے۔ اسی سورہ میں آگے بھی ان باتوں کی وضاحت ہو گی اور احادیث میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔

آخر میں اصل نکتے کی بات فرما دی کہ تنگی اور کشادگی کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں ہے بلکہ یہ چیز خدا کے اختیار میں ہے اس وجہ سے اگر وہ اپنا مال خدا سے بچاتا اور چھپاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اسی سے چھپاتا ہے جس کے اختیار میں بخشنے کے بعد چھین لینا بھی ہے۔

"وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ" میں یہ پہلو بھی ہے کہ آج خدا سے منہ چھپانے والے اس بات کو نہ بھولیں کہ کل ان کو خدا کو منہ دکھانا بھی ہے۔ اور یہ پہلو بھی ہے کہ جس دنیا کی زندگی کے لیے یہ خدا سے بنجالت کر رہے ہیں یہ زندگی تو چند روزہ ہے، اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جس کے لیے اصلی فکر ہونی چاہیئے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۲۴۶)

لفظ 'ملأ' کی تحقیق

'ملأ' کا اصل لغوی مفہوم بھرنا ہے۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی قوم کے اشراف و اعیان اور اکابر و سادات کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہو گی کہ قوم کے اعیان و اشراف ہی ہوتے ہیں جو اس کی چوپالوں، پنچایتوں، مجلسوں، کونسلوں اور اس کے درباروں کو پُر کرتے ہیں۔

'ملک' کا مفہوم

"ملک" کے معنی صاحب اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یہ اختیار و اقتدار مطلق قسم کا بھی ہو سکتا ہے جس طرح کا اختیار و اقتدار کسی جبّار و مطلق العنان بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے اور محدود و مقید قسم کا بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک پابند آئین و قانون یا پابند شریعت بادشاہ کو یا کسی امیر لشکر یا سپہ سالار کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس کے تقرر کے لیے بنی اسرائیل کے اعیان نے درخواست اس زمانے کے نبی (سموئیل) سے کی اور انہی کے تقرر سے اس کا تقرر ہوا اور توریت کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی کی ہدایات کے تحت[1] وہ انہی کی دعاؤں کے زیر اثر وہ اپنے سارے فرائض انجام دیتا تھا۔ قرآن نے یہ لفظ مدح و ذم دونوں کے محل میں استعمال کیا ہے۔ ایک بادشاہ وہ بھی تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے حجت کی اور جس نے زندگی اور موت دونوں پر اختیار کا دعویٰ کیا۔ قرآن نے اس کی مذمت کی۔ اس کے برعکس ذوالقرنین، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ بھی بادشاہ ہیں لیکن قرآن نے ان کی تعریف فرمائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک سیاسی نظام میں اصل اہمیت اس کی صورت کی نہیں بلکہ اس کی روح کی ہے۔ اگر اس کی روح خدا اور اس کے رسول کے قانون کے تابع ہے تو وہ قابل ستائش ہے، اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ اگر روح خدا اور رسول کی باغی ہے تو وہ قابل مذمت ہے عام اس سے کہ وہ ملوکیت ہو یا جمہوریت۔

آیت ۲۴۶ کی تعلیم اور واقعہ کی نوعیت

جس طرح اوپر کی آیات میں بنی اسرائیل کی ایمانی و اخلاقی موت و حیات کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو زندگی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ زندگی خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی سے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اس آیت میں اور آگے کی چند آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے اسی سلسلے کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو اجتماعی و سیاسی زندگی سے متعلق بعض نہایت اہم سبق دیے گئے ہیں۔

زیر بحث آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے کہ سموئیل نبی[2] نے بنی اسرائیل کے اندر تجدید و اصلاح اور ان کی تنظیم کا جو کام شروع کیا اس سے بنی اسرائیل کے اندر کچھ زندگی تو پیدا ہوئی اور وہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہونے اور ان سے اپنے بعض چھنے ہوئے

---

[1] سموئیل باب ۲۵ [2] ان کا زمانہ ۱۰۰۹ قبل مسیح کا زمانہ ہے۔

شہر واپس لینے میں کامیاب ہوئے لیکن بنی اسرائیل ہر طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے، ان کے کے بہت سے شہر اب بھی مخالفوں کے قبضے میں تھے، فلستیوں کے علاوہ موآب، بنی عمون، ادوم اور ضوباہ کے بادشاہوں سے بھی ہر وقت ان کو خطرہ تھا، پھر سموئیل نبی بوڑھے ہو چکے تھے اور انھوں نے بنی اسرائیل کی قیادت و تنظیم کی جو ذمہ داریاں اپنے بیٹوں کے سپرد کی تھیں وہ ان کو بنی اسرائیل کی توقع کے مطابق نہیں نباہ رہے تھے اس وجہ سے انھوں نے سموئیل سے یہ درخواست کی کہ وہ ان کی قیادت کے لیے کسی امیر کو مامور کریں تاکہ وہ اس کی سربراہی میں جہاد کر سکیں اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکیں[1]۔

سموئیل اپنے تجربات کی بنا پر جانتے تھے کہ بنی اسرائیل کی اصلی کمزوری یہ نہیں ہے کہ میدانِ جنگ میں رہنمائی کرنے والا ان کے پاس کوئی لیڈر نہیں ہے بلکہ ان کی اصلی کمزوری یہ ہے کہ جنگ کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر عزم و ایمان نہیں ہے اس وجہ سے انھوں نے، جیساکہ تورات سے واضح ہوتا ہے، ان کے اس مطالبے کی مخالفت کی اور ان کی اصلی کمزوری کی طرف توجہ دلائی کہ ایسا تو نہیں ہوگا کہ جہاد بھی فرض ہو جائے اور امیر بھی مقرر ہو جائے لیکن پھر تم جہاد سے انکار کر دو، اس پر انھوں نے بڑے جوش و جذبے کا اظہار کیا کہ ہم اپنے گھروں اور بیوی بچوں سے نکالے گئے ہیں، اگر اب بھی ہم جنگ نہ کریں گے تو پھر کب کریں گے، لیکن سموئیل کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ انھوں نے تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان کی قیادت کے لیے امیر بھی مقرر کر دیا اور جہاد کا حکم بھی دے دیا لیکن بنی اسرائیل نے حسب عادت عین وقت پر کندھا ڈال دیا۔ آگے کی تفصیلات سے معلوم ہوگا کہ اول تو انھیں منتخب سردار کی سرداری ہی پر اعتراض ہوا، پھر جب بادلِ ناخواستہ اس کی فوج میں بھرتی ہوئے بھی تو پہلے ہی امتحان میں پھسڈی ثابت ہوئے۔

"وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ" (اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے) سے مراد اس کا لازمی نتیجہ ہے یعنی جب خدا خوب جانتا ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۚ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۴۷)

لفظ 'بَعَث' کا مفہوم

"بَعَثَ" کے معنی اٹھانے، ابھارنے، بھیجنے کے ہیں پھر اسی مفہوم سے اس کے اندر مامور کرنے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ چونکہ اس سالار کا انتخاب سموئیل نے خدا کی ہدایت کے مطابق کیا تھا، جیساکہ تورات سے بھی ثابت ہے اور قرآن کے الفاظ اِصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ سے بھی واضح ہے، اس وجہ سے اس کے لیے بَعَثَ کا لفظ

---

[1] ملاحظہ ہو سموئیل باب

استعمال ہُوا۔

طالوت اور ساؤل — "طالوت" یہ اس مامور سالار کا نام ہے۔ تورات میں ان کا نام ساؤل آیا ہے، اور ان کے غیر معمولی طور پر قدآور ہونے کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے۔[1] اور جب وہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہُوا تو ایسا قدآور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے؛ کچھ بعید نہیں کہ اپنے اس غیر معمولی قد و قامت کی وجہ سے وہ لوگوں میں اس لقب سے بھی مشہور رہے ہوں۔ طالوت کے معنی "لمبے تڑنگے" کے ہیں۔ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں قریب قریب ہیں اس وجہ سے دونوں میں بہت سے مادے مشترک ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ تورات نے ان کا ذکر نام سے کیا ہے اور قرآن نے لقب سے۔ ورنہ پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے نام کے بارے میں تورات کا بیان غلط ہے، اصل نام طالوت ہی ہے۔ قرآن نے یہاں بعض دوسرے واقعات کے بارے میں بھی تورات کے بیانات کی تردید کی ہے آگے ہم ان کی طرف اشارہ کریں گے اور یہ بھی واضح کریں گے کہ اس طرح کے اختلافات کی صورت میں قرآن کا بیان کیوں قابل ترجیح ہے۔

طالوت کا انتخاب اور اس پر بنی اسرائیل کا اعتراض — بنی اسرائیل کے اپنے مطالبے پر جب سموئیل نے ایک سالار کا انتخاب کیا اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا تو بجائے اس کے کہ خوشی سے اس کو قبول کرتے انھوں نے حسبِ عادت اس انتخاب پر اعتراض کر دیا کہ بھلا یہ ہمارا سردار کیسے ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ حق دار تو ہم اس منصب کے ہیں؟ اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ طالوت کوئی مالدار آدمی نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں طالوت بنیامین کے قبیلہ سے تھے، بنیامین کا قبیلہ اوّل تو بنی اسرائیل کے تمام قبیلوں میں سب سے چھوٹا قبیلہ تھا پھر طالوت اس قبیلے کے تمام گھرانوں میں سب سے چھوٹے گھرانے کے تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کو اپنے قبیلے کی کمزوری کا خود بھی احساس تھا، چنانچہ جب سموئیل نے ان کے انتخاب کا ان سے ذکر کیا تو انھوں نے بڑی خاکساری کے ساتھ یہ الفاظ کہے۔

> "ساؤل نے جواب دیا کیا میں بنیمینی یعنی اسرائیل کے سب سے چھوٹے قبیلے سے نہیں؟ اور کیا میرا گھرانا بنیمین کے قبیلہ کے سب گھرانوں میں سب سے چھوٹا نہیں؟"[2]

ظاہر ہے کہ مالی اور عددی دونوں ہی اعتبار سے ایک کمزور آدمی کو بنی اسرائیل کے وہ قبیلے کس طرح خاطر میں لا سکتے تھے جن کو اپنی مضبوط عصبیت اور اپنی مالی برتری کا گھمنڈ تھا چنانچہ انھوں نے اس انتخاب پر اعتراض کر دیا۔ تورات میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

> "پر شریروں میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا، سو انھوں نے اس کی تحقیر کی اور اس کے لیے نذرانے نہ لائے پر وہ اَن سنی کر گیا۔"[3]

---

[1] سموئیل باب ۲۴   [2] سموئیل باب ۹: ۲۱   [3] سموئیل باب ۱۰: ۲۷

اور لوگ سموئیل سے کہنے لگے کس نے یہ کہا تھا کہ کیا ساؤل ہم پر حکومت کرے گا؟[1]

اعتراض کا جواب

اس اعتراض کا جواب سموئیل نبی نے یہ دیا کہ یہ انتخاب خدا کا انتخاب ہے۔ اسی نے اس کو تمھاری سرداری کے لیے چنا ہے۔ تم سرداری کو تعداد اور مال کے پیمانوں سے تولتے اور ناپتے ہو لیکن خدا علم اور عمل کے پیمانے سے ناپتا ہے۔ طالوت کے پاس اگرچہ خاندان کی شوکت اور مال کی فراوانی نہیں ہے لیکن علم کی وسعت اور عمل کی قوتوں سے وہ بھرپور ہے اور خدا کے انتخاب میں اصلی اہمیت انھی چیزوں کو حاصل ہے نہ کہ خاندان اور مال کو۔

اس کے بعد فرمایا کہ اقتدار و اختیار خدا کی دین ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور جس کو بخشتا ہے اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت بخشتا ہے۔ اس کا اقتدار تمام اقتداروں کو محیط ہے اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس کے پاس نہ بخشنے کے لیے کمی ہے، نہ بخش کر واپس لینے میں کوئی مانع ہے، نہ کسی معاملے کے ظاہر و باطن یا اس کے ماضی و مستقبل کا کوئی گوشہ اس سے مخفی ہے۔

"وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تم ہر معاملے کو اپنی تنگ اور محدود نگاہوں سے دیکھتے ہو لیکن خدا اپنے فیصلے اپنی قدرت اور اپنے علم کی روشنی میں صادر فرماتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۴۸)

'تابوت' کی حقیقت

"تابوت" کے معنی صندوق کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد بنی اسرائیل کا وہ صندوق ہے جس کو تورات میں "خدا کا صندوق" یا "خدا کے عہد کا صندوق" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے زمانے سے لے کر بیت المقدس کی تعمیر تک اسی صندوق کو بنی اسرائیل کے قبلہ کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ اس کو اپنے خیمۂ عبادت میں ایک مخصوص مقام پر نہایت مخصوص اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور تمام دعا و عبادت میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کے ربّی اور کاہن غیبی رہنمائی کے لیے بھی اسی کو مرجع بناتے۔ مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بھی بنی اسرائیل کا حوصلہ قائم رکھنے میں اس صندوق کو سب سے بڑے عامل کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک تو اس میں تورات اور صحرا کی زندگی کے دور کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئیں لیکن پھر اس میں حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور ان کے خاندان کے بعض اور تبرکات بھی محفوظ کر دیے گئے۔

'سکینۃ' کی تحقیق

"سَكِيْنَة" کے معنی اطمینان، قرار اور حوصلہ کے ہیں، بالخصوص وہ اطمینان و حوصلہ جو پرخطر حالات

---

[1] سموئیل باب ۱۰-۱۲

اور جنگ کے مصائب میں آدمی کے عزم کو قائم رکھے۔ مثلاً هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا ۴۔ الفتح (وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں عزم و اطمینان اتارا تاکہ وہ اپنے ایمان میں اضافہ کریں) فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۱۸۔ فتح (تو ان کے دلوں میں جو کمزوری تھی اللہ نے اس کو جان لیا پس ان پر عزم و اطمینان اتارا اور ایک فوری فتح سے ان کو نوازا) اس تابوت کے ساتھ بنی اسرائیل کو جو والہانہ عقیدت تھی اس کا ایک خاص پہلو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ بھی تھا کہ مصائب و مشکلات اور میدانِ جنگ میں ان کے حوصلے (MORALE) کو قائم رکھنے میں اس کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ سے اس کے اسی خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے۔

تابوت کی بنی اسرائیل میں واپسی

اوپر فلسطیوں کے ہاتھوں اس تابوت کے چھینے جانے کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کے چھن جانے کو بنی اسرائیل کے بزرگوں نے اسرائیل سے ساری حشمت کے چھن جانے سے تعبیر کیا اور ساری قوم نے اس عظیم حادثے پر ماتم کیا۔ چنانچہ اس دور میں بنی اسرائیل کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس تابوت کو اپنے دشمنوں سے واپس لینے کا تھا۔ اسی بنا پر سموئیل نے طالوت کے انتخاب کے خدائی انتخاب ہونے کی یہ نشانی ٹھہرائی کہ اس کے بعد تابوت تمہارے پاس فرشتوں کی مدد سے آپ سے آپ آجائے گا۔ چنانچہ ان کی یہ پیشینگوئی پوری ہوئی اور فلسطیوں نے اس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر اس کو بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا۔ سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

"اب تم ایک نئی گاڑی بناؤ اور دو دودھ والی گائیں جن کے جوا نہ لگا ہو، لو۔ اور ان گایوں کو گاڑی میں جوتو اور ان کے بچوں کو گھر لوٹا لاؤ اور خداوند کا صندوق لے کر اس گاڑی پر رکھو اور سونے کی چیزوں کو جن کو تم جرم کی قربانی کے طور پر ساتھ کرو گے، ایک صندوقچے میں کر کے اس کے پہلو میں رکھ دو اور اسے روانہ کر دو کہ چلا جائے اور دیکھتے رہنا۔ .... سو ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور دو دودھ والی گائیں لے کر ان کو گاڑی میں جوتا اور ان کے بچوں کو گھر میں بند کر دیا اور خداوند کے صندوق .... اور صندوقچہ کو گاڑی پر رکھ کر دیا۔ ان گایوں نے بیت شمس کا سیدھا راستہ لیا۔ وہ سڑک ہی سڑک ڈکارتی گئیں اور دہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلستی سردار بیت شمس کی سرحد تک ان کے ساتھ گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے انھوں نے جو آنکھیں اٹھائیں تو صندوق کو دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔ سموئیل باب ۷-۱۳۔

تابوت کی گاڑی کا بغیر کسی گاڑیبان اور بغیر کسی محافظ کے اور وہ بھی دو ایسی گایوں کے ذریعے سے جن کے دودھ پیتے بچے گھروں پر روک لیے گئے تھے، اس طرح بغیر دہنے بائیں مڑے ٹھیک منزل پر پہنچ جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو کروبیوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔ اسی چیز کو

"تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیانات کا اختلاف

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیان میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کی زیر بحث آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی واپسی کا واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جب طالوت کا خدا کے مقرر کردہ بادشاہ کی حیثیت سے اعلان ہوا ہے اور یہ واقعہ گویا ایک نشان تھا اس بات کا کہ طالوت کا انتخاب من جانب اللہ ہے، سموئیل نے خدا کے حکم سے ان کو مسح کر کے برکت دی ہے اور ان کا تقرر بنی اسرائیل میں ایک نئے دور خیر و برکت اور ایک جدید تاریخ کامیابی و فتحمندی کا آغاز ہے۔

اس کے بالکل برعکس تورات کا بیان یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے ہی تابوت کو ایک گاڑی پر رکھ کر، جیسا کہ اوپر کے حوالے میں تصریح ہے، فلسطیوں نے گاڑی بنی اسرائیل کے علاقہ کی طرف ہانک دی تھی۔ اور تابوت پوری حفاظت کے ساتھ ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس طرح واپس کرنے کی وجہ تورات میں یہ بیان ہوئی ہے کہ فلسطینی تابوت چھین لے جانے کو تو چھین لے گئے لیکن وہ ان کے لیے مصیبت بن گیا، انھوں نے اس کو جہاں جہاں رکھا وہاں مختلف قسم کی وبائیں پھوٹ پڑیں جس سے ان کے ہزاروں آدمی مر گئے بالآخر اس سے تنگ آکر انھوں نے سات ماہ کے بعد اپنے نجومیوں کے مشورے سے اس سے نجات حاصل کرنے کی وہ تدبیر اختیار کی جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔

قرآن کے بیان کے صحیح ہونے کے وجوہ

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں بیانوں میں سے کون سا بیان روایت اور درایت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے؟ ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر قرآن کا بیان صحیح اور تورات کا بیان غلط ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ان واقعات کے بیان کے خاتمہ پر قرآن نے یہ کہا ہے کہ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۲۵۲ - بقرہ (یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو) اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ امر یہاں قرآن کے پیش نظر ہے کہ یہ واقعہ جس شکل میں وہ پیش کر رہا ہے وہ تورات کے بیان سے مختلف ہے لیکن واقعہ کی صحیح شکل وہی ہے جس شکل میں اس کو قرآن پیش کر رہا ہے نہ کہ جس شکل میں اس کو تورات پیش کر رہی ہے اور پھر اس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک دلیل قرار دیا ہے کہ قدیم آسمانی صحیفوں کی جن سرگزشتوں کے جاننے کا تمھارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ان کو اس صحت کے ساتھ پیش کرنا کہ یہ سرگزشتیں محض بے مقصد داستان سرائی کے بجائے اپنے منطقی ربط و تسلسل اور اپنے حکیمانہ ثمرات و نتائج کے ساتھ لوگوں کے سامنے آئیں بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تم کو اپنا رسول بنایا اور ان باتوں سے تمھیں اپنی وحی کے ذریعہ سے آگاہ فرمایا۔

ایک ہٹ دھرم یہ کہہ سکتا ہے کہ ان واقعات کے پیش کرنے میں قرآن کا بیان تورات کے بیان سے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات کا براہ راست کوئی علم نہیں تھا، وہ نعوذ باللہ سنی سنائی باتیں پیش کرتے تھے اس وجہ سے ان کا بیان تورات سے مختلف ہوتا تھا۔ لیکن یہ کہنا کسی طرح بھی

جنگ بدر کے پیش آنے سے پہلے اس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کی جنگ میں مسلمانوں کو دکھا دیا تھا۔ ہم سورۂ انفال میں یہ واضح کریں گے کہ یہود بدر کا نقشہ دیکھ کر اس حقیقت کو تاڑ گئے تھے لیکن انھوں نے مشرکین کو برانگیختہ کرنے کے معاملہ میں بالکل شیطان کی روش اختیار کی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اس جنگ میں طالوت کے ساتھیوں کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی تھی جتنی بدر میں حضورؐ کے ساتھیوں کی تھی۔

فوج کی اطاعت کا امتحان

"اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ" دشمن کے آنے سامنے ہونے سے پہلے طالوت نے اپنی فوج کے ڈسپلن اور ان کی اطاعت و وفاداری کا امتحان لینے کے لیے یہ اعلان کیا کہ سامنے جو فلاں ندی ہماری راہ میں آرہی ہے اس کے ذریعہ سے اللہ تمھاری جانچ کرے گا، تم میں سے جو اس کا پانی پی لے گا وہ میرا ساتھی نہ بن سکے گا جو اس کو بالکل نہ پیے گا وہ میرا ساتھی ہوگا۔ اگر کسی نے ہاتھ سے ایک آدھ چلو پی لیا تو وہ قابلِ درگزر ہے۔ اس امتحان میں فوج کی اکثریت فیل ہو گئی۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس امتحان میں پورے اترے۔

بنی اسرائیل نے امیر لشکر کا انتخاب تو بڑے ہمہمہ سے کرایا لیکن یہ لوگ نظم اور ڈسپلن کے معاملے میں، بالخصوص جہاں جان و مال کی قربانی کا سوال ہو، بڑے کچے تھے۔ اس کا اظہار جیسا کہ اوپر گزرا، سموئیل نبی نے پہلے ہی دن کر دیا تھا۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ انھی کی ہدایت سے طالوت نے اس امتحان کا اعلان کیا تاکہ ان کے کھرے کھوٹے میں پہلے ہی سے امتیاز ہو جائے اور عین میدانِ جنگ میں ان کے ہاتھوں دھوکا نہ کھانا پڑے، جو کچے ہیں وہ پہلے ہی سے چھٹ کے الگ ہو جائیں۔ یہ امتحان چونکہ سموئیل نبی کی ہدایت کے تحت ہوا اس وجہ سے طالوت نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔ جس ندی کے ذریعہ سے یہ امتحان ہوا اس کا نام یہاں مذکور نہیں اس لیے کہ مقصود امتحان کا ذکر ہے نہ کہ کسی ندی کا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دریائے اردن ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس وادی کے درمیان کا کوئی چشمہ یا نالا ہو جو دونوں فوجوں کے درمیان حائل تھی۔

اس امتحان میں سو فی صدی کامیابی کے لیے تو شرط یہ تھی کہ اس کا پانی سرے سے کوئی چکھے ہی نہیں جیسا کہ ارشاد ہے وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ لیکن ایک آدھ چلو پی لینے کو قابلِ درگزر قرار دیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ بھی بِيَدِهٖ کی قید لگی ہوئی تھی کہ مبادا یہ اجازت کٹورے، گلاس اور ڈونگے تک نوبت پہنچا دے۔

"وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" سے وہ صداقت شعار اور کامل الایمان لوگ مراد ہیں جو اس امتحان میں پورے اترے۔ یہاں "اٰمَنُوْا" کا فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ لوگ جو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اس امتحان میں پھسڈی ثابت ہوئے وہ اپنے دعوائے ایمان میں بھی منافق تھے۔

"قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ" ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو خوب پانی پی پی کے وہیں ڈھے گئے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ندی کو پار کرنے کی بھی زحمت نہیں

اٹھائی بلکہ اسی پار سے کھڑے کھڑے انھوں نے آگے بڑھنے والے ساتھیوں کو سنا دیا کہ اب ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی ہمت نہیں۔ یہاں جالوت کے نام لینے سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اس کی ہیبت ان لوگوں کے دلوں پر بہت تھی۔

فتح کا انحصار کثرت و قلت پر نہیں بلکہ عزم و ایمان پر ہے

"قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ الاٰيه" لفظ ظن کی تحقیق ہم آیت ۴۶ کے تحت بیان کر آئے ہیں۔ یہ اوپر والے بزدلوں کے جواب میں طالوت اور ان کے باایمان ساتھیوں کا قول ہے۔ ان کی خاص صفت جس کا یہاں ذکر فرمایا وہ یہ ہے کہ وہ اللہ سے ملنے کا گمان رکھتے تھے۔ اس خاص صفت کے ذکر کی وجہ، جیسا کہ آیت ۱۵۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، یہ ہے کہ وہ حقیقی شجاعت جو خدا کی راہ میں موت کو زندگی سے بھی زیادہ عزیز و محبوب بنا دیتی ہے وہ مومن کے اس عقیدے سے پیدا ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والے مرتے نہیں ہیں بلکہ حقیقی زندگی اور اپنے رب کی ملاقات سے مشرف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے ہمت چھوڑ بیٹھنے والے ساتھیوں کو ابھارا کہ فلسطینیوں کی کثرت تعداد سے مرعوب ہو کر ہمت نہ ہارو، اصل شے تعداد نہیں بلکہ اللہ کی تائید اور اس کی نصرت ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ نہایت قلیل التعداد گروہ محض اللہ کے حکم اور اس کی تائید سے دل بادل فوجوں پر غالب آگیا ہے۔ خدا کی تائید حاصل کرنے کے لیے جو چیز مطلوب ہے وہ صبر و استقامت اور عزم و ہمت ہے نہ کہ تعداد کی کثرت و قلت۔ شاید طالوت کے بیٹے یونتن نے اسی موقع پر وہ فقرہ کہا ہو جو سموئیل میں نقل ہے۔

"سو یونتن نے اس جوان سے جو اس کا سلاح بردار تھا کہا آ ہم اور پران نامختونوں کی چوکی کو چلیں، ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے کیونکہ خداوند کے لیے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعے سے بچانے کی قید نہیں"۔ سموئیل باب ۱۴۔

فوج کے امتحان کے متعلق تورات اور قرآن کے بیانات کا اختلاف

تورات میں اس امتحان کا ذکر نہیں ہے لیکن اسی سے ملتے جلتے ایک امتحان کا ذکر ہے۔

"اور اسرائیلی مرد اس دن بڑے پریشان تھے کیونکہ ساؤل نے لوگوں کو قسم دے کر یوں کہا تھا کہ جب تک شام نہ ہو اور میں اپنے دشمنوں سے بدلہ نہ لے لوں اس وقت تک اگر کوئی کچھ کھائے تو وہ ملعون ہو۔ اس سبب سے ان لوگوں میں سے کسی نے کھانا چکھا تک نہیں اور سب لوگ جنگل میں جا پہنچے اور وہاں زمین پر شہد تھا اور جب یہ لوگ جنگل میں پہنچ گئے تو دیکھا کہ شہد ٹپک رہا ہے پر کوئی اپنا ہاتھ اپنے منہ تک نہیں لے گیا اس لیے کہ ان کو قسم کا خوف تھا لیکن یونتن نے اپنے باپ کو ان لوگوں کو قسم دیتے نہیں سنا تھا سو اس نے اپنے ہاتھ کے عصا کے سرے کو شہد کے چھتے میں بھونکا اور اپنا ہاتھ اپنے منہ سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں روشنی آئی۔ تب ان لوگوں میں سے ایک نے اس سے کہا کہ تیرے باپ نے لوگوں کو قسم دے کر سخت تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ جو شخص آج کے دن کھانا کھائے وہ ملعون ہو۔ اور لوگ بے دم سے ہو رہے تھے۔ تب یونتن نے کہا کہ میرے باپ نے ملک کو دکھ دیا ہے، دیکھو میری آنکھوں میں ذرا سا شہد چکھنے سے کیسی روشنی آئی۔ کتنا زیادہ اچھا ہوتا اگر سب لوگ دشمن کی لوٹ میں سے جو ان کو ملی دل کھول کر کھاتے ...... سو وہ لوگ لوٹ پر

گئے اور بھیڑوں، بکریوں، بیلوں اور بچھڑوں کو لے کر ان کو زمین پر ذبح کیا اور خون سمیت کھانے لگے۔

سموئیل باب ۱۴: ۲۴۔۳۲

اس واقعے سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ طالوت نے فلسطینیوں سے جنگ کے موقع پر اپنی فوج کا امتحان لیا تھا اور اس امتحان میں ان کی پوری فوج ناکام رہی تھی یہاں تک کہ طالوت کے بیٹے یونتن بھی، جن کا کردار تورات کے دوسرے بیانات سے نہایت بلند ثابت ہوتا ہے، اس امتحان میں نہ صرف یہ کہ ناکام رہے بلکہ مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انھی کی غلط رہنمائی سے ان کے باپ کی پوری فوج گمراہ ہوئی۔

قرآن کا بیان مندرجہ ذیل پہلوؤں سے تورات کے بیان سے مختلف ہے۔

ایک یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان اس وقت لیا ہے جب دشمن سے عملاً مڈبھیڑ ہو چکی ہے اور مقصود اس امتحان سے صرف یہ تھا کہ جب تک دشمن کا اچھی طرح قلع قمع نہ ہو جائے لوگ کھانے پینے میں مصروف نہ ہوں۔ برعکس اس کے قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان دشمن سے مڈبھیڑ ہونے سے پہلے لیا ہے اور مقصود اس سے اپنی فوج کا جائزہ لینا تھا کہ اس میں کتنے ایسے ہیں جو کٹھن حالات میں ثابت قدم رہ سکیں گے اور کتنے محض دکھاوے کے مجنوں ہیں جن کا دعوائے عشق آزمائش کی پہلی ہی چوٹ سے ہرن ہو جائے گا۔

دوسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے کھانے کی مناہی کی تھی۔ اس کے برعکس قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مناہی فوج کے مارچ کے دوران میں ایک خاص ندی یا نالے کے پانی کے لیے تھی۔

تیسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت کی پوری فوج اس امتحان میں ناکام رہی یہاں تک کہ خود ان کے فرزند بھی ناکام رہے بلکہ انھی نے پوری فوج کے لیے اس ناکامی کی راہ کھولی۔ اس کے خلاف قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اندر سے ایک جماعت اپنے عزم و ایمان پر قائم رہی اور اسی کے عزم و ایمان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فلسطینیوں پر فتح دی۔

قرآن کا بیان صحیح اور بامقصد ہے

اب یا تو یہ مانا جائے کہ تورات میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ الگ ہے اور قرآن میں جو بیان ہوا ہے وہ الگ۔ یا یہ مانا جائے کہ واقعہ تو ایک ہی ہے، تورات میں اس کو بے احتیاط راویوں نے بالکل مسخ اور اور بے مقصد بنا کے رکھ دیا ہے قرآن نے اس کو بالحق یعنی بالکل ٹھیک ٹھیک اور اس کے فوائد و مصالح کے ساتھ سنا دیا۔ ان دونوں میں سے جو بات بھی صحیح ہو، یہ بہرحال ہر صاحب ذوق تسلیم کرے گا کہ قرآن کا بیان ہر پہلو سے بامقصد، نتیجہ خیز اور پُر حکمت ہے۔ برعکس اس کے تورات کا بیان ایک بالکل بے مقصد داستان سرائی ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۲۵۰-۲۵۱)

جالوت

جالوت، فلسطینیوں کا سپہ سالار تھا۔ تورات میں اس کا نام جاتی جولیت آیا ہے۔ یہ بڑا گرانڈیل، دیوہیکل اور ماہر جنگ سپہ سالار مانا جاتا تھا، دشمنوں پر اس کا بڑا رعب تھا، خاص طور پر بنی اسرائیل اس سے بہت مرعوب تھے۔

حضرت داؤدؑ کی زندگی کا آغاز

داؤد، یہ وہی حضرت داؤد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور جن کی صلب سے حضرت سلیمان علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدا غریبانہ لیکن انتہا نہایت شاندار ہوئی۔ انھوں نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے کہ خداوند نے مجھے بھیڑ سالے سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا۔ یہ طالوت کی اس فوج میں شامل تھے جس کا ذکر چلا آرہا ہے۔ اس شمولیت کے متعلق تورات میں دو مختلف روایتیں ہیں۔ ایک سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس جنگ کے پیش آنے سے پہلے ہی طالوت کے سلاح برداری کی حیثیت سے ان کے لشکر میں داخل ہو چکے تھے اور در پردہ یہ سموئیل کے ممسوح اور مستقبل کے بادشاہ بھی تھے۔ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل وقت کے وقت اپنی بکریاں چراگاہ میں چھوڑ کر اپنے بڑے بھائیوں کو، جو جنگ میں شریک تھے، اپنے باپ کے حکم سے کچھ کھانے کی چیزیں دینے آئے۔ یہاں انھوں نے دیکھا کہ جالوت مقابلہ کے لیے چیلنج دے رہا ہے لیکن کوئی اس کے مقابلے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ان کی غیرت کو جوش آیا۔ انھوں نے طالوت سے اس کے مقابلہ کی اجازت مانگی، یہ اس وقت ایک نوخیز، سرخ رو اور خوش قامت نوجوان تھے طالوت کو ان کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اجازت دینے میں تردد ہوا۔ لیکن جب انھوں نے کہا کہ میں اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے شیروں اور ریچھوں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں، بھلا اس نامختون فلسطینی کی کیا حیثیت ہے کہ یہ زندہ خداوند کی فوجوں کو رسوا کرے تو طالوت نے ان کے عزم و ہمت کو دیکھ کر ان کو اجازت دے دی اور خود اپنا جنگی لباس پہنا کر اپنے مخصوص اسلحہ سے ان کو لیس کیا۔ اس وقت تک ان کا زمانہ بھیڑوں بکریوں کی چرواہی میں گزرا تھا، اس جنگی لباس اور ان جنگی اسلحہ کا ان کو کوئی تجربہ نہیں تھا، وہ ان کو پہن کر کچھ بندھا بندھا سا محسوس کرنے لگے۔ آخر طالوت کی اجازت سے اس قید سے رہائی حاصل کی اور چرواہوں کی طرح اپنی فلاخن اٹھائی، چادر کے ایک کونے میں کچھ پتھر رکھے اور وقت کے سب سے بڑے دلیر کے مقابل میں جا کے ڈٹ گئے۔ پہلے تو اس نے ان کا مذاق اڑایا لیکن جب ان کی طرف سے اس کو ترکی بہ ترکی جواب ملا تو اس نے کہا کہ اچھا! آج تیرا گوشت چیلوں اور کوؤں کو کھلاتا ہوں۔ اتنے میں حضرت داؤدؑ نے فلاخن میں پتھر رکھ کر جو اس کو مارا تو پتھر اس کے سر سے چپک کر رہ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے بڑے سپہ سالار کا ایک الھڑ چرواہے کی فلاخن سے اس طرح مارا جانا ظاہر ہے کہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ چنانچہ فلسطینی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور ادھر بنی اسرائیل کی عورتوں کی زبان پر یہ گیت جاری ہو گیا ؎

"ساؤل نے تو ہزاروں کو مارا پر داؤد نے لاکھوں کو مارا۔"

بس اسی واقعہ سے حضرت داؤد کی زندگی کا آغاز ہوا اور پھر وہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس مقام پر

پہنچے جوان کے لیے مقدر تھا۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ، میں اس حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے کہ فتح ہو یا شکست، جو کچھ بھی پیش آتا ہے اس کا اصل تعلق قلت و کثرت اور وسائل و تدابیر سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اس وجہ سے اصل اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہیے نہ کہ اسباب و وسائل پر۔ اس سے مقصود اسباب و وسائل کے اختیار کرنے کی نفی نہیں بلکہ تنہا انہی کو وسیلۂ ظفر سمجھ لینے کی نفی ہے۔ حضرت داؤد جنھوں نے ایک دیو ہیکل سورما کو ایک پتھر سے ڈھیر کر دیا، اگرچہ اس زمانے تک نبی نہیں تھے، لیکن اس حقیقت سے آگاہ تھے، چنانچہ انھوں نے جالوت کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا کہ

"اور یہ ساری جماعت جان لے کہ خداوند تلوار اور بھالے کے ذریعے سے نہیں بچاتا اس لیے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا۔" سموئیل باب ۱۷: ۴۷

یہی بات قرآن مجید کی آیت وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" سے ثابت ہوتی ہے۔

"وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ" یہ ان انعامات کا بیان ہے جو اس واقعے کے بعد حضرت داؤد پر ہوئے۔ اس کے بعد وہ طالوت کے داماد بھی ہو گئے اور پھر بنی اسرائیل کے بادشاہ بھی۔ علاوہ ازیں ان کو حکمت کا وہ خزانہ بھی عطا ہوا جس کا مظہر زبور ہے۔ درحقیقت یہی حکمت ہے جس کا جوڑ جب بادشاہی کے ساتھ ملتا ہے تو وہ بادشاہی زمین میں خدا کی خلافت کا درجہ حاصل کرتی ہے، یہ نہ ہو تو بادشاہی چنگیزی ہے۔ بادشاہی اور درویشی کا یہی امتزاج ہے جو اللہ کی نظروں میں پسندیدہ ہے۔ اور حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز سب درویش بادشاہ تھے اس لیے کہ ان کی بادشاہی کا تخت و تاج سونے چاندی سے نہیں بلکہ حکمت کے لعل و گہر سے آراستہ ہوا تھا۔

یہاں ایک چھوٹا سا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ فرمایا عَلَّمَهٗ مِمَّا شَآءَ نہیں فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسلوب اس لیے اختیار فرمایا کہ یہ بات حضرت داؤدؑ کے ساتھ خاص ہو کے نہ رہ جائے۔ بلکہ یہ ایک سنت اللہ کے بیان کا اسلوب اختیار کر لے کہ اللہ نے اس کو وہ کچھ سکھایا اور بتایا جو وہ اپنے ایسے بندوں کے لیے چاہتا ہے کہ وہ ان کو بتائے اور سکھائے۔

جہاد کی ضرورت اور اس کی حکمت

"وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ الاٰیۃ" یہ جہاد کی ضرورت اور اس کا فلسفہ بیان ہوا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ جہاد کا حکم نہ دیتا اور اس کے صالح بندے زمین کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لیے تلوار نہ اٹھاتے تو اشرار و مفسدین دنیا کو شر و فساد سے بھر دیتے اور اللہ کی زمین نیکی اور تقویٰ کے تمام آثار سے خالی ہو جاتی۔ قرآن میں جہاد کی اس ضرورت و حکمت کی طرف مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ اشارے کیے گئے ہیں، مثلاً سورۂ حج میں فرمایا۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔ ۴۰ حج (اور اگر اللہ ایک گروہ کو دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو صومعے اور گرجے اور عبادت خانے اور مسجدیں، جن میں کثرت

سے خدا کا ذکر ہوتا ہے، سب ڈھائے جا چکے ہوتے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مذہب کے راہبانہ اور جوگیانہ تصور کے اثر سے عام طور پر جنگ اور جہاد کو تقویٰ اور دین داری کے منافی تصور کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جنگِ بدر سے پہلے تک تو قریش مسلمانوں کی کمزوری کو ان کے خلاف ایک دلیل ٹھہراتے رہے اور جنگ بدر کے بعد ان کے جوشِ جہاد کو ان کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اس کی تفصیلات اپنے مقام میں آئیں گی۔ یہاں قرآن نے پہلے سے اس طرح کے تمام اعتراضات کا جواب دے دیا کہ انبیاء اور صالحین جو جہاد کرتے ہیں اس سے مقصود حق اور عدل کا قیام اور شر و فساد کا استیصال ہوتا ہے ورنہ خدا کی زمین نیکی اور بھلائی کے لیے بالکل بنجر ہو کے رہ جائے۔ اس وجہ سے صالحین کا جہاد اہلِ زمین کے لیے خدا کی ایک بہت بڑی عنایت ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۵۲)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات اور آپ کی رسالت کا اثبات

یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت، یہ دونوں آیتیں سلسلۂ کلام کے بیچ میں بطور التفات وارد ہیں یعنی اصل سلسلۂ کلام کو روک کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا اور ارشاد ہوا کہ بنی اسرائیل نے اپنی تاریخ کی ایک نہایت اہم سرگزشت بالکل بے مقصد اور بے معنی بنا کر رکھ دی تھی۔ اب ہم نے اس کو بالکل ٹھیک ٹھیک اس کے نتائج و فوائد اور اس کے حِکَم و مصالح کے ساتھ تمہیں سنایا ہے تاکہ اس آئینے میں تم اور تمہارے ساتھی اپنے مستقبل کے نقشۂ کار کو دیکھ سکو اور یہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ تم انبیاء و رسل کے مبارک سلسلے کی کڑی ہو ورنہ جس چیز کے تمہارے پاس جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس کو تم کس طرح جان سکتے اور وہ بھی ایسی صحت و صداقت کے ساتھ کہ اصل واقعہ تمام غیر منطقی اور غیر فطری ملاوٹوں سے بالکل پاک ہو کر لوگوں کے سامنے آگیا۔ اگر اہلِ کتاب معاملے کے صرف اسی ایک پہلو پر غور کرتے تو تمہاری رسالت کے ثبوت کے لیے یہی دلیل کافی تھی لیکن ان کا اندھا بہرا تعصب اس امر میں مانع ہے کہ وہ اپنے نبی کے سوا کسی اور رسول کی رسالت اور اس کے لیے کوئی فضیلت تسلیم کر سکیں حالانکہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں میں سے کسی کے لیے بھی مطلق برتری کا دعوےٰ صحیح نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے تمام رسولوں کو کسی نہ کسی فضیلت سے مختص کیا ہے اور سب کے لیے طرح طرح کے درجات ہیں لیکن اہلِ کتاب گروہی تعصبات میں مبتلا ہو کر اپنے سوا سب کی تکذیب اور سب کی مخالفت کے لیے کمربستہ ہیں، سو اس حالت پر صبر کرو اور ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں شر کو بھی مہلت دے رکھی ہے۔ بلاشبہ اگر وہ چاہتا تو یہ کچھ وہ نہ کر پاتے لیکن اس نے یہی چاہا ہے اور جو کچھ اس نے چاہا ہے اسی میں حکمت اور مصلحت ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۲۵۳)

تِلْكَ کا اشارہ ان رسولوں کی طرف ہے جن کا حوالہ اوپر وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔

رسولوں کے بارے میں صحیح روش

اس آیت میں اس صحیح رویے کی وضاحت ہے جو اللہ کے رسولوں کے بارے میں ان کی امتوں کو اختیار کرنا تھا، لیکن انھوں نے اس کو اختیار نہیں کیا بلکہ اس کی جگہ ایک بالکل غلط رویہ اختیار کر لیا جس کے سبب سے ان کے درمیان تعصبات کی دیواریں کھڑی ہوگئیں اور وہ ایک دوسرے کی دشمن اور مخالف ہو کر باہم جنگ و جدل میں مبتلا ہوگئیں۔ مقصود اس بیان سے یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واضح کرنا ہے کہ آج تمھاری مخالفت میں بھی یہ اہل کتاب جو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اس کی بڑی وجہ ان کی یہی غلط روش ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں میں سے ہر رسول کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اور اس فضیلت کے اعتبار سے وہ دوسروں پر ممتاز ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا ہے یہ ان کی فضیلت کا ایک خاص پہلو ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کھلے کھلے معجزات دیے اور روح القدس کی خاص تائید سے ان کو نوازا، یہ ان کے مخصوصات میں سے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے رسولوں کو درجات و مراتب عطا ہوئے ہیں جو ان کے لیے خاص ہیں۔ انبیاء و رسل کے فضائل کے باب میں یہی نقطۂ نظر حقیقت کے مطابق ہے۔ لیکن ان انبیا کی امتوں نے جو روش اختیار کی وہ یہ ہے کہ ان میں سے جس نے جس نبی و رسول کو مانا سارے فضائل و خصوصیات کا جامع تنہا اسی کو بنا کر رکھ دیا اور دوسرے کسی نبی و رسول کے لیے کسی فضیلت کا تسلیم کرنا ان کے نزدیک ایمان کے منافی قرار پا گیا۔ اس تعصب و تنگ نظری کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلی امتوں میں سے ہر امت اپنے اپنے خول میں بند ہو کر رہ گئی اور اس کے لیے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی برکات سے فائدہ اٹھانے کی راہ مسدود ہوگئی۔ اگر وہ صحیح روش اختیار کرتیں تو ہر رسول ان کا رسول اور ہر ہدایت ان کی ہدایت ہوتی اور وہ اس ہدایت میں سے بھی حصہ پاتیں جو اب قرآن مجید کی صورت میں آخری ہدایت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ظاہر ہوئی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ بنی اسرائیل میں بھی اشارہ فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔ ۵۵ (اور ہم نے انبیا میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عنایت کی)۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

آیت کے دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ نے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اس نے پسند فرمائی ہے اور جس کا قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں جبر کا طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس میں شبہ نہیں کہ کسی کے لیے بھی ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ بندوں کو آزادی دی کہ وہ اپنی سوچ سمجھ اور اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ چاہیں کفر

کی راہ اختیار کریں، چاہیں ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر وہ ایمان کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا صلہ پائیں گے اور اگر کفر کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا انجام دیکھیں گے۔ آخر میں فرمایا کہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے) سو اس نے یہی چاہا کہ وہ اس معاملے میں بندوں پر جبر نہ کرے اور جب اس نے یہی چاہا تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ اسی کے اندر حکمت و مصلحت ہے، کیونکہ خدا کا کوئی ارادہ حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتا۔

یہاں اس قانون کے بیان کرنے سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے معاملے میں آپ کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ آپ لوگوں تک حق واضح الفاظ میں پہنچا دیں۔ اس کو قبول کرنا یا رد کرنا یہ ان کے اوپر چھوڑ دیں۔ یہ نہ تو آپ کی ذمہ داری ہے اور نہ آپ اس کے لیے پریشان ہوں۔

آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق وَاٰيَدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے جو الفاظ آئے ہیں ان کی حقیقت اسی سورہ کی آیت ۸۷ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ سے جس کلام کا ذکر ہے اس سے مراد وہ براہِ راست مخاطبۂ الٰہی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مشرف فرمایا۔ اس مخاطبت کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے اور قرآن نے بھی اس کی طرف جا بجا اشارے کیے ہیں۔

۸۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۵۴-۲۵۶

اوپر سے مضمون جہاد اور انفاق کا چلا آ رہا تھا پھر ضمناً دو آیتیں التفات کی بطور تنبیہ و تذکیر آ گئیں جن کی نوعیت جملہ معترضہ کی ہے۔ اس کے بعد انفاق کا مضمون از سر نو آ گیا۔ اس مضمون کی وضاحت کے لیے جو استدلال اختیار فرمایا ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی اصل چیز تو خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی ہے لیکن یہ منکرین یہ کرنے کے لیے تو تیار نہیں ہیں البتہ انھوں نے اپنے جی سے خدا کے شریک و شفیع بہت سے گھڑ لیے ہیں اور ان کی شفاعت و حمایت پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں حالانکہ یہ جھوٹے سہارے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس حماقت میں مبتلا ہیں وہ اپنے اوپر بہت بڑا ظلم ڈھا رہے ہیں۔

اس کے بعد نہایت مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں توحید کی حقیقت واضح فرمائی اور شرک کی تردید کی تاکہ ایک بالکل غلط سہارے پر جو لوگ جی رہے ہیں وہ چونکتے ہوں اور خدا پرستی کی صحیح راہ اختیار کریں۔

اس کے بعد یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ تبلیغ و تعلیم اور انذار و تبشیر کا جو حق تھا وہ ادا ہو چکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے وہ غیر اللہ سے کٹ کر اللہ کی مضبوط رسّی کو تھام لے اور جس کا جی چاہے اپنے غلط سہاروں کے اعتماد پر اپنی عاقبت برباد کرے، اللہ کو ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی سمجھ بوجھ سے ایمان لائیں، اگر وہ سب کو نیکی کے راستے پر ہانک دینا چاہتا تو وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن ہدایت و ضلالت

کے معاملے میں اس نے اس جبر کو پسند نہیں فرمایا۔

اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ کون لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دیتا ہے اور کون لوگ ہیں جو حق کی وضاحت کے بعد بھی گمراہی کی وادیوں ہی میں بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۵۴-۲۵۶

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِمَّا رَزَقْنَٰكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَٰعَةٌ ۗ وَٱلْكَٰفِرُونَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿٢٥٤﴾ ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلْحَىُّ ٱلْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُۥ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَّهُۥ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ ۗ مَن ذَا ٱلَّذِى يَشْفَعُ عِندَهُۥٓ إِلَّا بِإِذْنِهِۦ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَىْءٍ مِّنْ عِلْمِهِۦٓ إِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ ۖ وَلَا يَـُٔودُهُۥ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ ٱلْعَلِىُّ ٱلْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾ لَآ إِكْرَاهَ فِى ٱلدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشْدُ مِنَ ٱلْغَىِّ ۚ فَمَن يَكْفُرْ بِٱلطَّٰغُوتِ وَيُؤْمِنۢ بِٱللَّهِ فَقَدِ ٱسْتَمْسَكَ بِٱلْعُرْوَةِ ٱلْوُثْقَىٰ لَا ٱنفِصَامَ لَهَا ۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾

ترجمہ آیات ۲۵۴-۲۵۶

اے ایمان والو، جو کچھ ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہو گی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش نفع پہنچائے گی اور جو لوگ انکار کرنے والے ہیں اپنے اوپر اصلی ظلم ڈھانے والے وہی ہیں۔ ۲۵۴

اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے، سب کا قائم رکھنے والا

ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں اور وہ بلند اور عظیم ہے۔ ۲۵۵

دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط رسی پکڑی جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۵۶

۸۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۵۴)

انفاق کی دلیل اور اس کی تسہیل

اوپر آیت ۲۴۵ میں انفاق کی جو دعوت گزری ہے، یہ اس کی مزید تفصیل ہے۔ مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ میں جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، انفاق کی دلیل بھی ہے اور اس کی تسہیل بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تم سے انفاق کا جو مطالبہ کر رہا ہے تو یہ تم پر گراں نہ گزرے۔ وہ تم سے کوئی تمھاری چیز نہیں مانگ رہا ہے بلکہ اپنی ہی بخشی ہوئی چیز مانگ رہا ہے۔ پھر یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اس نے بخشا ہے اس سارے کے لیے اس کا مطالبہ ہے بلکہ وہ اس میں سے صرف ایک حصہ کے انفاق کا مطالبہ کر رہا ہے۔

پھر فرمایا کہ اس دنیا کے مال و متاع کا کوئی ابدی و دائمی نفع ہے تو صرف اسی صورت میں ہے جب آج اس کو خدا کی راہ میں خرچ کر کے اس کو ایک لازوال خزانے کی صورت میں تبدیل کر لو اس لیے کہ آگے جو دن آنے والا ہے اس میں نفع پہنچانے والی چیز اگر کوئی ہے تو صرف وہ نیکی ہے جو اس دنیا میں کمائی گئی ہو۔ اس کے سوا اس عالم میں کوئی چیز کام آنے والی نہیں۔ اس دنیا میں خرید و فروخت سے بھی کام چل جاتے ہیں، دوستیاں بھی کام دے جاتی ہیں اور سفارشیں بھی بعض اوقات نفع پہنچا دیتی ہیں لیکن اُس دنیا میں ان چیزوں کی ساری راہیں بند ہوں گی، وہ صرف ایمان اور عمل صالح کے نتائج کے ظہور کی دنیا ہو گی۔

یا مددگار کی احتیاج پیش آئے۔

آیت الکرسی توحید کی ایک عظیم آیت ہے

اوپر والی آیت میں یہ فرمایا کہ اس دن کے آنے سے پہلے پہلے خدا کی راہ میں خرچ کر لو جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش کچھ نفع پہنچائے گی۔ یہ اسی مضمون کی مزید تفصیل ہے گویا ردِ شفاعت اور ردِ شرک کے اس مضمون نے توحید خالص کی وضاحت کے لیے ایک تقریب پیدا کر دی اور اس طرح توحید کے بیان میں ایک ایسی آیت نازل ہوگئی جس کی خوبیوں اور بلاغتوں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

سب سے پہلے فرمایا کہ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد اس کے لیے ان صفات کا اثبات کیا جو اس کی الوہیت کا لازمی تقاضا ہیں اور جن کے نہ ماننے سے اس کی الوہیت کی نفی ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ان باتوں سے اس کو بری قرار دیا جن کے ماننے سے بھی اس کی الوہیت کو بٹہ لگتا ہے۔ جن صفات کا اثبات کیا ہے ان میں سب سے پہلے اس کے حیّ و قیّوم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ حیّ کے معنی زندہ کے ہیں اور قیّوم کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور سب کو قائم رکھنے والی اور سب کو سنبھالنے والی ہو۔ ظاہر ہے کہ جو خود زندہ نہ ہو وہ تمام دنیا جہان کے لیے زندگی بخش کس طرح ہو سکتا ہے اور جو خود اپنی ذات سے قائم نہ ہو وہ آسمان و زمین کو قائم رکھنے والا کس طرح ہو سکتا ہے اور جو ذات ان صفات سے عاری ہو اس کو خدا ماننے کے کیا معنی؟ اور جب خدا ان صفات سے متصف ہے اور لازماً اس کو ان صفات سے متصف ہونا چاہیے بھی تو پھر کسی کو اس کا شریک و سہیم ماننا ایک بالکل بے جوڑ سی بات ہے۔

اس طرح قرآن نے ان تمام معبودوں کی نفی کر دی جو نہ زندہ ہیں، نہ زندگی کا سرچشمہ اور نہ خود قائم ہیں اور نہ دوسروں کے قائم رکھنے والے بلکہ خود اپنی زندگی اور اپنے قیام و بقا کے لیے ایک حیّ و قیوم کے محتاج ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی نہ نیند۔ یہ نیند کی ابتدا اور اس کی انتہا دونوں سے اس کو بری قرار دیا گیا ہے اور یہ اس کے حیّ و قیوم ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ نیند، موت کے ظلال و آثار اور اس کے مظاہر و مبادیات میں سے ہے اس وجہ سے یہ خدا کی شان کے منافی ہے۔ پھر یہ اس کے قیوم ہونے کے بھی منافی ہے، جو خود نیند سے مغلوب ہو کر اپنے کو قائم نہ رکھ سکے گا وہ دنیا کو کیا قائم رکھے گا اور جب وہ ہر لحہ خود بیدار ہے اور اپنی دنیا کی نگرانی کر رہا ہے تو پھر یہ کیوں فرض کیا جائے کہ وہ اس دنیا کے انتظام و انصرام میں کسی اور کا بھی محتاج ہے۔

'شفاعت' کی حقیقت

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے اور اسی کے اختیار میں ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے قرآن کے مخاطبوں میں سے نہ کسی کو انکار تھا اور نہ کسی کے لیے اس سے انکار کی گنجائش تھی، اس لیے کہ اس سے انکار کے معنی خدا کی خدائی کے انکار کے تھے۔ چنانچہ اس مسلمہ حقیقت سے شفاعت کے اس عقیدے کے باطل ہونے کی طرف رہنمائی فرمائی جس میں عرب کے مشرکین اور اہل کتاب سب کسی نہ کسی نوعیت سے مبتلا تھے۔ فرمایا کہ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ

لفظ 'طاغوت' کی تحقیق

طاغوت بروزن ملکوت وجبروت، 'طغی' کے مادہ سے ہے جس کے معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ جو چیز اپنی حد مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لیے عربی میں کہیں گے "طغی" "طغی الماء" پانی حد سے آگے بڑھ گیا۔ قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی اس کے لیے طاغیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدود عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لیے استعمال ہوا اور جو حدود بندگی سے نکل جائے اس کو طاغوت کہنے لگے۔ پھر وسعت اختیار کر کے یہ لفظ ان چیزوں پر بھی حاوی ہو گیا جو حدودِ بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ بنیں۔ اہلِ لغت اسی وجہ سے اس کی تشریح عام طور پر یوں کرتے ہیں کہ اَلطَّاغُوْتُ عِبَارَةٌ عَنْ كُلِّ مُعْتَدٍ وَكُلِّ مَعْبُوْدٍ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (طاغوت سے مراد ہر وہ وجود ہے جو بندگی سے نکل جائے اور ہر وہ معبود ہے جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے)

قرآن نے اس لفظ کو مختلف مقامات میں استعمال کیا ہے اور ہر جگہ اس کے مقابل کا ذکر کر کے اس کے مختلف مفہوموں پر روشنی ڈال دی ہے۔ مثلاً زیر بحث آیت میں ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ یہاں اللہ کے تقابل سے واضح ہے کہ طاغوت سے مراد ماسوا اللہ ہے۔ سورہ نحل میں ہے اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یہاں بھی اللہ کے سوا دوسرے معبودان باطل مراد ہیں۔ سورہ نسا میں ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ اس کے بعد معاً فرمایا فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ جس سے متعین ہو گیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے اور شیطان کا لفظ شیاطین انس اور شیاطین جن دونوں کو شامل ہے اسی طرح ایک دوسرے مقام میں اس لفظ کو کتابِ الٰہی اور طریقۂ رسول کے مخالف طریقہ کے لیے استعمال فرمایا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۔ ۶۰-۶۱ اس آیت میں يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ کے بالمقابل تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ طاغوت سے یہاں مراد وہ چیزیں ہیں جو کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول کے خلاف ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو خدا کی بندگی و اطاعت سے نکل جانے یا نکل جانے کا باعث اور ذریعہ ہو، وہ سب اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہے۔

'لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ' کا مفہوم

اوپر آیت وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ الایۃ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے جس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا یہ اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ کے رسول کی اصل ذمہ داری صرف حق کو واضح طور پر پہنچا دینا ہے اور جب یہ کام ہو چکا، حق باطل سے بالکل الگ ہو کر سامنے آ گیا، تو رسول کی جو ذمہ داری ہے وہ پوری ہو چکی۔

اب ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جن پر حجت تمام ہو چکی ہے۔ وہ چاہیں تو ایمان لائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر اڑے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں جبرِ فطری کی راہ نہیں اختیار فرمائی ہے بلکہ لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی بخشی ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ساری دنیا کو نیکی ہی کی ڈگر پر ہانک دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس نے لوگوں کو آزادی دی ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں گے وہ اس کا صلہ پائیں گے، جو کفر کی راہ اختیار کریں گے وہ اس کی سزا بھگتیں گے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے مثلاً وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ، اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۳۵-۳۷ نحل (اور یہ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کو نہ پوجتے، نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے ایسا ہی سوال اٹھایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو کیا رسولوں پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری بھی ہے؟ ہم نے تو ہر امت میں ایک رسول اٹھایا اس دعوت کے ساتھ کہ لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو، تو ان میں سے کچھ ایسے ہوئے جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کچھ ایسے ہوئے جو گمراہی کے سزاوار ٹھہرے۔ تو ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا! اگر تم ان لوگوں کی ہدایت کے حریص ہو تو یاد رکھو کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت دینے والا نہیں ہے جن کو گمراہی کا سزاوار ٹھہرا چکا اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے)

یہ جبرِ فطری کی نفی ہے، جبرِ قانونی کی نہیں

قرآن مجید میں یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے مختلف مقامات میں بیان ہوا ہے۔ ہم نے طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک آیت کے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے ٹکڑے میں جس جبر و اکراہ کی نفی کی گئی ہے اس سے مقصود جبرِ فطری کی نفی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے کہ وہ اپنی مشیت و قدرت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر چلا دے یا گمراہی کی طرف ہانک دے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا تو نہیں تھا لیکن یہ بات اس کی حکمت اور اس کے عدل کے خلاف ہوتی۔ اس نے اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار فرمایا ہے کہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے حق اور باطل دونوں کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے، پھر جو لوگ حق کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو راہِ حق اختیار کرنے کی توفیق ارزانی کرتا ہے اور جو لوگ باطل کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو اس کے لیے ڈھیل دے دیتا ہے۔

مقصود اس حقیقت کے واضح کرنے سے ایک تو ان کفار و مشرکین کو جواب دینا تھا جو اس جبر کی آڑ

لے کر اپنے کفر و شرک کو ثواب ٹھہرانا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ان کا عقیدہ و عمل باطل ہے تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، وہ اپنی قدرت کاملہ سے کام لے کر ان کو ٹھیک کیوں نہیں کر دیتا۔ دوسرے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح کرنا تھا کہ بحیثیت نبی اور رسول کے ان کی ذمہ داری صرف دین حق کو اچھی طرح واضح کر دینا ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ لازماً ایمان و ہدایت کی راہ اختیار بھی کر لیں۔

اس زمانے میں بعض کم سواد اس آیت کو اس کے اس مفہوم سے ہٹا کر جبر قانونی کی نفی کے معنی میں لیتے ہیں اور اس سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ چونکہ اسلام میں اکراہ نہیں ہے اس وجہ سے اسلام کے نام سے فلاں اور فلاں باتوں کو جو مستوجب سزا قرار دیا جاتا ہے یہ محض مولویوں کی من گھڑت باتیں ہیں، اسلام سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس گروہ کے اس استدلال کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی شریعت حدود و تعزیرات سے ایک بالکل خالی شریعت ہے جس میں ہر شخص کو سب کچھ کر گزرنے کی چھوٹ حاصل ہے۔ نہ زنا، تہمت اور چوری پر کوئی سزا ہے۔ نہ ڈکیتی، رہزنی، فساد فی الارض اور بغاوت پر کوئی تعزیر۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام میں حدود و تعزیرات کا ایک پورا نظام ہے جس کا نفاذ واجباتِ دین میں سے ہے۔ اگر ایک شخص نماز نہ پڑھے یا روزے نہ رکھے تو اسلامی حکومت اس کو بھی سزا دے سکتی ہے یہ چیز لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان اسلام کے خلاف بغاوت کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے بھی اسلامی قانون میں سزا ہے۔ یہ چیز بھی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے خلاف نہیں ہے۔ فتنہ و فساد کو خدا کی زمین سے مٹانے کے لیے اسلام نے اہل ایمان پر جہاد بھی واجب کیا ہے، یہ چیز بھی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے منافی نہیں ہے۔

اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ایک شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد بھی جو اس کے جی میں آئے کرتا پھرے اور اس پر کوئی گرفت نہ ہو بلکہ وہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسلام کے حدود و قیود کی پابندی کرے۔ لادینی نظاموں میں مذہب کو نجی زندگی سے متعلق مانا جاتا ہے اس وجہ سے ان میں حکومت کی نافرمانیوں پر تو سزائیں اور تعزیرات ہیں لیکن خدا سے بغاوت کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اسلام میں مذہب کے پرائیویٹ زندگی سے مخصوص ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلامی حکومت اصلاً خدا ہی کی حکومت ہوتی ہے اور ریاست کا سیاسی ادارہ صرف خدا کے احکام و قوانین کے اجرا و نفاذ کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس میں خدا کی ہر نافرمانی قابل گرفت ہوتی ہے۔ خواہ وہ نافرمانی مخفی ہو یا ظاہر۔ فرق ہے تو یہ ہے کہ مخفی نافرمانیوں پر خدا کی اخروی عدالت گرفت کرے گی اور ظاہری نافرمانیوں پر اسلام کی دنیوی عدالتیں گرفت کرنے اور ان پر سزا دینے کی مجاز ہیں۔ ارتداد بھی اسی زمرے کا ایک جرم بلکہ بہت بڑا جرم ہے اور اس پر جو سزا ایک اسلامی نظام میں دی جاتی ہے۔ وہ اس بات پر نہیں دی جاتی کہ ایک

شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس بات پر دی جاتی ہے کہ اس نے خدا کی حکومت اور اس کے قانون کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔

اسی طرح اس امر سے ہمیں انکار نہیں ہے کہ مجرد کسی قوم کے اندر کفر کا وجود اس امر کے لیے کافی وجہ نہیں ہے کہ اسلام کے علمبرداران کے خلاف جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور تلوار کے زور سے ان کو اسلام پر مجبور کر دیں۔ کافر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق لازماً ہر شکل میں معاندانہ ہی نہیں بلکہ مصالحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاد اصلاً فتنہ اور فساد فی الارض کے مٹانے کے لیے شروع ہوا ہے اگر یہ چیز کہیں پائی جاتی ہے تو اہلِ ایمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ استطاعت رکھتے ہوں تو اس فتنہ اور فساد فی الارض کو مٹانے کے لیے جہاد کریں، خاص طور پر اس فتنہ کو مٹانے کے لیے جو اہلِ کفر کے ہاتھوں اس لیے برپا کیا جائے کہ اہلِ ایمان کو ان کے دین سے پھیرا جائے یا اسلامی نظام کو برباد کیا جائے۔ اس فتنے کے استیصال کے بعد اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس نے اپنے نظام میں اس بات کی پوری گنجائش رکھی ہے کہ اہلِ کفر اپنے کفر پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت کی رعایا رہ سکتے ہیں۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ صرف مشرکین بنی اسمٰعیل کا معاملہ اس کلیہ سے ایک استثنا کی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے وجوہ تفصیل کے ساتھ اسی سورہ کی آیات ۱۹۲-۱۹۳ کے تحت بیان کر چکے ہیں اور مزید وضاحت کے ساتھ اس پر ہم انشاء اللہ سورۂ برأت کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے) یہ مذکورہ اکراہ کی نفی کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ خدا کی طرف سے اتمامِ حجت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے اپنے نبی کے ذریعے سے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا۔ اس کے بعد اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ جس کا جی چاہے حق کو اختیار کرے اور جس کا جی چاہے باطل کے ساتھ چمٹا رہے۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جو لوگ اس وضاحت کے بعد بھی باطل سے چمٹے رہیں گے تو ایک دن آئے گا کہ خود یہ باطل ان کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ نہ ٹوٹنے والی رسی صرف ان کے ہاتھ میں ہو گی جو آج غیر اللہ سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف یکسو ہو جائیں۔

آخر میں سَمِيعٌ عَلِيمٌ کی صفت کا حوالہ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ ہی کی رسی پکڑتے ہیں وہ ایک ایسے کا دامن پکڑتے ہیں جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے اس وجہ سے وہ ہر قدم پر اور ہر مرحلے میں ان کا ملجا و ماوٰی ہے۔ برعکس اس کے جو غیر اللہ کی پرستش کر رہے ہیں وہ ایسوں کے سہارے پر جی رہے ہیں جنھیں ان کے آغاز و انجام کا تو در کنار خود اپنے آغاز و انجام کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہاں تک کہ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ کچھ نادان لوگ ان کی پرستش کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی اس بے خبری کا اظہار آخرت میں کریں گے اور اپنے ان پرستاروں پر لعنت بھیجیں گے۔

۸۲۔ آگے کا مضمون ———— آیات، ۲۵۷-۲۶۰

'لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ الاٰية' میں ہدایت و ضلالت سے متعلق جس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے آگے کی چند آیات میں اس کی مزید وضاحت فرمادی ہے۔ پھر کلام اصل سلسلہ بیان یعنی انفاق سے جڑ گیا ہے۔ یہ وضاحت تین واقعاتی مثالوں کے ذریعے سے کی گئی ہے اس لیے کہ حقائق جب تک مثالوں سے نہ واضح کیے جائیں اس وقت تک وہ اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتے۔ قرآن مجید کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ پہلے ہر مسئلے سے متعلق عقلی و فطری دلائل پیش کرتا ہے۔ پھر تاریخی اور واقعاتی مثالوں سے اس کو مدلل اور دل نشین بناتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ ہدایت و ضلالت سے متعلق اصل قانون الٰہی اصولی شکل میں پیش کرنے کے بعد تین مثالیں پیش کی ہیں جن میں سے ایک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جو شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور جن کو گمراہی سے نکل کر ہدایت کی طرف آنا نصیب نہیں ہوتا اور دوسے یہ واضح ہوتا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ دستگیری فرماتا ہے اور ان کو ہر قسم کی الجھنوں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی اور شرح صدر کی طمانیت بخشتا ہے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۵۷-۲۶۰

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥٧﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٥٨﴾ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا ۚ